بابتہ جون سنہ ۱۹۴۴ء
شمارہ (۲)

نظامِ ادب

طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ

پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب (مدیر)

قاضی احمد بشیر الدین (معتمد)

عاصمۃ الرحمٰن (شریک معتمد)

اراکین

ن صاحب (سال چہارم)   سید موسیٰ رضا صاحب (سال سوم)

ر احمد صاحب (سال دوم)   نواب احمد یار جنگ بہادر (سال اول)

خصوصی اشاعت

بیادگار

قادر حسین خاں صاحب مرحوم

ام۔ اے، بار۔ اٹ۔ لا

سابق صدر نظام کالج حیدرآباد دکن

فہرست مضامین خصوصی اشاعت

شذرات

نظامِ ادب کا دوسرا شمارہ "خصوصی اشاعت" کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اولاً مجلسِ ادارت نے یہ طے کیا تھا کہ پورا ایک شمارہ مرحوم کے لئے وقف کیا جائے، ہماری یہ تحریک علیٰ حالہ برقرار رہی تا آنکہ نئے صدر صاحب کلیہ کی آمد کے بعد منتر کا ئے ادارت انگریزی نے موصوف کے اجلاس پر یہ بات طے کی کہ بہترین صورت یہ ہوگی اگر انگریزی اور اُردو کی مشترکہ خصوصی اشاعت نکالی جائے جس میں مرحوم سے متعلق مضامین شائع کئے جائیں۔ یہ بھی طے پایا کہ اس کی ضخامت سو صفحے سے زائد نہ ہو اور اس کے اخراجات کے لئے چندہ وصول کیا جائے، اس صورت میں یہ خوبی بھی بتائی گئی کہ دونوں رسالوں کی معمولی اشاعتوں پر کوئی اثر نہ پڑے گا اور نہ کسی رسالہ کا مالیہ زیرِ بار ہوگا۔ اس کے علاوہ مرحوم سے متعلق وصول شدہ تمام مضامین ایک ہی جگہ ہوں گے اور پڑھنے والے کے لئے کوئی بات تشنہ نہ رہ جائے گی۔

نظامِ ادب اور انگریزی رسالہ کے پہلے شماروں کی تقسیم تک تو یہی قرارداد برقرار رہی لیکن رسالۂ انگریزی کی دوسری اشاعت کی تیاریوں کے آغاز میں تبدیلِ سیاست کی وجہ سے، انگریزی رسالے والوں نے اس تجویز کو اپنی حکمتِ عملی کے مطابق درست نہ خیال فرمایا اور معتمد نظامِ ادب تک یہ اطلاع بھیجا دی گئی کہ مشترکہ انگریزی اُردو قادر حسین خاں خصوصی اشاعت کی تجویز ناقابلِ عمل معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ دوسرے شمارے کے ساتھ خانصاحب مرحوم سے متعلق وصول شدہ مضامین ایک ضمیمہ کی شکل میں درج رسالہ کر دیئے جائیں اور یہی تجویز مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح خاں صاحب مرحوم کی تجویز پورے ایک شمارے سے سو صفحے کی مشترکہ خصوصی اشاعت پر آگئی اور رجعتِ قہقری کرتی ہوئی ضمیمہ تک پہنچ گئی لیکن الاعمال بالنیات ہم نے مضامین کے لئے ایک عام اپیل شائع کی تھی وعدہ شدہ اتنے مضامین فراہم ہو گئے کہ ضمیمہ رسالے کا جزوِ اعظم بن گیا۔ ضخامت وہی حسبِ معمول ڈیڑھ یا سوا سو صفحہ کی ہوتی تو زیادہ سے زیادہ دو ایک غیر متعلقہ مضامین کی گنجائش نکلتی۔ لیکن اب صورت یہی

نئی آیڈیٹی شفیق صدر صاحب نے مشفقانہ مشورہ دیا کہ صفحات کی تحدید کر دی جائے۔ صفحات کی تحدید کے بعد غیر متعلقہ مضامین کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہتا تھا۔ اب ضمیمہ ہی ضمیمہ رہ گیا۔ قاعدۂ کلیہ ہے کہ جب بڑی ہستی کا وجود فنا ہو جائے تو چھوٹی ہی ہستی بزرگی اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ہمارے ضمیمہ نے بھی غیر متعلقہ مضامین کے حذف سے "یادگار اشاعت" کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح ابتدائی تحریک ہی نے عملی جامہ پہنا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ

راقم الحروف نے چند مضامین پر تعارفی نوٹ لکھے تھے اور خیال تھا کہ ہر نوٹ متعلقہ مضمون کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جائے لیکن اس صورت میں رسالہ کے حسنِ ظاہری میں فرق آ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اب وہ شذرات کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ نوٹ کہیں متن کی تائید اور کہیں متن کی تصریح میں لکھے گئے ہیں۔

عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر اس درسگاہ کے ایک مایۂ ناز قدیم طالب علم، بزم ادب کے سرپرست اور نظام ادب کے محسن ہیں۔ نواب صاحب معز سے زیادہ مادرِ علمیہ کی روایات سے اور کوئی واقف نہیں۔ اسی وقوف کی بناء پر نواب صاحب معز کا یہ فرمانا کہ مسٹر قادر حسین خاں نے خصوصیت کے ساتھ نظام کالج کی خدمات انجام دی ہیں، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ مرحوم کیونکر صدور کلیہ کی فہرست میں سب سے ممتاز ہیں۔

وہ اس درسگاہ کے پہلے ہندوستانی صدر تھے اور دیسی ہونے کے باوجود ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ انگریز صدور ان کے آگے ماند نظر آتے تھے، مرحوم نے نہ کبھی اپنے ہندوستانی بھائیوں کو حقارت سے دیکھا نہ کبھی کسی غیر سے مرعوب ہوئے نہ کبھی کسی پر ناجائز دباؤ ڈالنے کا خیال کیا۔ عمر بھر صراطِ مستقیم ہی کو جادۂ حق سمجھا کئے۔[1]

مرحوم صدور کالج میں سب سے زیادہ عالم و فاضل گزرے ہیں۔ ایسی ہمہ گیر اور ہمہ دانی قابلیت کا صدر بہت کم کسی کالج کو نصیب ہوا ہوگا۔ ان کے وہ شاگرد جو کالج چھوڑنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے اکثر علمی مشوروں یا معاشی اور سیاسی الجھنوں کی گتھیاں سلجھانے انہیں کی طرف رخ کیا کرتے تھے اور انہوں نے مرحوم کو ہمیشہ اپنا شفیق استاد اور مخلص دوست پایا۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر طنز ور صاحب کا پیام صفحہ (۲۶)، میجر م ن، کورلا والا صاحب کا پیام صفحہ (۹)
[2] ملاحظہ ہو ڈاکٹر بشارت علی صاحب کا مضمون صفحہ (۲۱)، محمد کرم اللہ صاحب کا مکتوب صفحہ (۳۰)، سید محمد ہادی حسن صاحب کا پیام صفحہ (۳۱)

ہر کہ و مہ سے خلوص اور شفقت سے پیش آنا خاں صاحب کا خاص شیوہ تھا۔ مرحوم نے اپنی شان کو محض عہدۂ صدارت ہی سے وابستہ نہ رکھا تھا بلکہ اس سے بلند ہو کر وہ ایک شفیق باپ اور مربی کے درجہ تک پہنچ گئے اُن کی عظمت کا راز کالج کی صدارت ہی میں نہیں بلکہ ان کے اس ہمدردانہ برتاؤ میں پوشیدہ تھا جو وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ [1]

مرحوم نے چار سال کی قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو اوروں سے ربع صدی میں بھی نہ بن پڑتے۔ اور تعلیمی نظام کو ایسا درست کیا کہ نتائج کے اعتبار سے جامعۂ مدراس کا کوئی کلیہ نظام کالج کی ہمسری نہ کرسکا۔ خصوصاً ۱۹۴۳ء کے نتائج ایسے عمدہ رہے کہ نظام کالج تو کیا تمام جامعۂ مدراس کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یادگار رہ جائینگے [2]

وہ صرف درس و تدریس ہی میں شہرت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ پیکرِ اخلاق، دریائے علم اور مجسمۂ مروّت و شفقت بھی تھے جنوبی ہند کے مسلمانوں کے آئیڈیل ہونے کے علاوہ وہ مغرب کے خزانۂ علم سے پورے پورے بہرہ ور، زیورِ شائستگی سے آراستہ، ادب و آداب کے سخت پابند، اسلام کے سچّے فدائی اور قوم و ملت کے سچے ہوا خواہ تھے [3]

ذاتی وجاہت، لباس کی نفاست، انگریزی تحریر و تقریر میں ڈھی جاؤ اور کی مرحوم کی ہمسری کے دعوے دار ہوسکتے تھے۔ وہ اسٹیج کے مقرر بے شک نہ تھے لیکن ان کی نرم بات چیت، جو تردوں پر کی جانے والی دھواں دھار تقریروں سے زیادہ موثر اور دلپذیر ہوتی تھی۔ انھیں گفتگو کا ایک غیر معمولی ڈھب تھا۔ زبان کھولتے ہی مخاطب کو ہمہ تن گوش بنا لیتے اور ختم کلام پر سامع اُن کا بندۂ بے دام ہو جاتا [4]

مرحوم نے جو تعمیری کام کیا ہے وہ کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے طلبہ کے کردار اور ذہنوں ہی کو نہیں سنوارا بلکہ ظاہری حیثیت سے بھی نظام کالج کو ایک خاص امتیاز کا مالک بنا دیا ہے۔ وسیع پیمانے پر ہاکی اور فٹ بال کے میدانوں کی تیاری، کرکٹ اور فٹبال کے لئے پویلین کی شاندار عمارت، ڈائیننگ ہال اور اس میں میز کرسیوں کا باقاعدہ انتظام، چمن بندی، سبزہ زار، سالار جنگ ہال کی آرائش، مفید مطلب تصاویر سے لکچر ہالوں کی زیبائش، کتب خانہ میں مفید کتابوں کا غیر معمولی اضافہ، کالج ہاسٹل اور عالیہ بورڈنگ ہاؤز کے باقاعدہ انتظامات، ان سب باتوں نے نظام کالج کو ایک شانِ امتیاز پیدا کردی ہے۔ [5]

خاں صاحب کے عہد کی ایک اور بڑی خصوصیت طلبہ اور طالبات کی تعداد میں کثیر اضافہ ہے۔

آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصف جاہی، صدر المہام تعمیرات کا پیام خاں صاحب کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جو اصحاب یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ سلطنت کے امرائے عظام اور اربابِ حکومت کی نگاہ میں مرحوم کی کیا وقعت تھی وہ اس پیام کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

یہ جان لینا از بس ضروری ہے کہ مرحوم نے درس و تدریس کے دائرے تک محدود رہ کر نہیں فرقہ بندی

---

[1] ملاحظہ ہو راجہ دھرم کرن بہادر کا پیام صفحہ (۲) ۔ مضمون ڈاکٹر زاہد علی صاحب صفحہ (۱۷) [2] ملاحظہ ہو ناصر الدین صاحب کا مضمون صفحہ ۲۸، شہنشاہ بیگم صاحبہ کا مضمون صفحہ ۵۲ [3] ملاحظہ ہو علامہ آغا احمد حسین صاحب کلامی کا پیام صفحہ ۳، طلبائے وانمباڑی کالج کا مضمون صفحہ ۶۳، شیخ ابو محمد صاحب کا مضمون صفحہ ۶۲ [5] آغا حیدر حسن صاحب، ارتنا سوامی صاحب، شہنشاہ بیگم صاحبہ کے مضامین ملاحظہ ہوں صفحہ (۱۳)، (۵۵)، (۶۷)

ہر کہ ومہ سے خلوص اور شفقت سے پیش آنا خاں صاحب کا خاص شیوہ تھا۔ مرحوم نے اپنی شان کو محض عہدۂ صدارت ہی سے وابستہ نہ رکھا تھا بلکہ اس سے بلند ہو کر وہ ایک شفیق باپ اور مربی کے درجہ تک پہنچ گئے ان کی عظمت کا راز کالج کی صدارت ہی میں نہیں بلکہ ان کے اس ہمدردانہ برتاؤ میں پوشیدہ تھا جو وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔[1]

مرحوم نے چار سال کی قلیل مدت میں وہ کار ہائے نمایاں انجام دیئے جو اوروں سے ربع صدی میں بھی نہ بن پڑتے۔ اور تعلیمی نظام کو ایسا درست کیا کہ نتائج کے اعتبار سے جامعۂ مدراس کا کوئی کلیہ نظام کالج کی ہمسری نہ کر سکا۔ خصوصاً ۱۹۴۳ء کے نتائج ایسے عمدہ رہے کہ نظام کالج تو کیا تمام جامعۂ مدراس کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیش کیلئے یادگار رہ جائینگے۔[2]

وہ صرف درس و تدریس ہی میں شہرت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ پیکرِ اخلاق، دریائے علم اور مجسمۂ مروت و شفقت بھی تھے جنوبی ہند کے مسلمانوں کے آئیڈیل ہونے کے علاوہ وہ مغرب کے خزانۂ علم سے پورے پورے بہرہ ور، زیورِ شائستگی سے آراستہ، ادب و آداب کے سخت پابند، اسلام کے سچے فدائی اور قوم و ملت کے سچے ہوا خواہ تھے۔[3]

ذاتی وجاہت، لباس کی نفاست، انگریزی تحریر و تقریر میں ڈھونڈے ہی چار آدمی مرحوم کی ہمسری کے دعوے دار ہو سکتے تھے۔ وہ اسٹیج کے مقررِ بے شک نہ تھے لیکن ان کی نرم بات چیت، چبوتروں پر کی جانے والی دھواں دھار تقریروں سے زیادہ موثر اور دلپذیر ہوتی تھی۔ انکی گفتگو کا ایک غیر معمولی رعب تھا۔ زبان کھولتے ہی مخاطب کو ہمہ تن گوش بنا لیتے اور ختمِ کلام پر سامع ان کا بندۂ بے دام ہو جاتا۔[4]

مرحوم نے جو تعمیری کام کیا ہے وہ کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے طلبہ کے کردار اور ذہنوں ہی کو نہیں سنوارا بلکہ ظاہری حیثیت سے بھی نظام کالج کو ایک خاص امتیاز کا مالک بنا دیا ہے۔ وسیع پیمانے پر ہاکی اور فٹ بال کے میدانوں کی تیاری، کرکٹ اور فٹبال کے لئے پویلین کی شان دار عمارت، ڈائیننگ ہال اور اس میں میز کرسیوں کا باقاعدہ انتظام، چمن بندی، سبزہ زار، سالار جنگ ہال کی آرائش، مفید مطلب تصاویر سے لکچر ہالوں کی زیبائش، کتب خانہ میں مفید کتابوں کا غیر معمولی اضافہ، کالج ہاسٹل اور عالیہ بورڈنگ ہاؤز کے باقاعدہ انتظامات، ان سب باتوں نے نظام کالج میں ایک شانِ امتیاز پیدا کر دی ہے۔[5]

خاں صاحب کے عہد کی ایک اور بڑی خصوصیت طلبہ اور طالبات کی تعداد میں کثیر اضافہ ہے۔

آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصف جاہی صدر المہام تعمیرات کا پیام خاں صاحب کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جو اصحاب یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ سلطنت کے امرائے عظام اور اربابِ حکومت کی نگاہ میں مرحوم کی کیا وقعت تھی وہ اس پیام کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

یہ جان لینا از بس ضروری ہے کہ مرحوم نے درس و تدریس کے دائرے تک محدود رہ کر نہیں فرقہ بندی،

---

[1] ملاحظہ ہو راجہ دھرم کرن بہادر کا پیام صفحہ (۲) [2] مضمون ڈاکٹر [illegible] صاحب صفحہ (۱۷) [3] ملاحظہ ہو ناصر الدین صاحب کا مضمون صفحہ ۴۸ [4] شہنشاہ بیگم صاحبہ کا مضمون صفحہ ۵۹ [5] ملاحظہ ہو غلام احمد صاحب کلامی کا پیام صفحہ [illegible] [6] طلبائے دار المباشرت کالج کا مضمون صفحہ ۳۴ [7] شیخ ابو محمد صاحب کا مضمون صفحہ ۲۳ [8] آغا حیدر حسن صاحب، ارتنا سوامی صاحب، شہنشاہ بیگم صاحبہ کے مضامین ملاحظہ ہوں صفحہ (۱۳)، (۵۵)، (۶۷)

کا سنگار ہو کر نہیں، تنگ دلی اور کوتہ نظری کا اسیر ہو کر نہیں بلکہ امتیاز قوم و ملت کو اٹھا کر محض خدمتِ خلق سے اپنے آپ کو ممتاز کیا ہے اور اپنی عظمت کے نقوش ہر کہ و مہ کے قلب کی گہرائیوں میں مرتسم کر گئے ہیں یقیناً خاں صاحب کو اس بد نصیب گروہ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا جو امتیاز کا ساغر و مینا لئے ہوئے اکثر لطف مے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے مرحوم اُن خوش قسمتوں میں تھے جنہوں نے خدمتِ خلق، اور عبادتِ خالق سے اپنی شرابِ ناب کو دو آتشہ کر کے پیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قوم و ملک کی ایسی ذی وقار اور ذمہ دار ہستی انہیں "پُر جوش قوم پرست ہستیوں میں ایک جلیل القدر ہستی" کہنے پر مجبور ہے۔ ؎۱

نواب رحمت یار جنگ بہادر کا پیام نہایت بصیرت افروز ہے۔ نواب صاحب موصوف نے عام لوگوں کی طرح خاں صاحب کو ایک ہی رُخ سے نہیں دیکھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کے دونوں رُخ موصوف کے پیش نظر تھے۔ کہنا پڑتا ہے کہ کوتوالِ شہر نے اپنی کردار شناسی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ پیام اس بات کی کھلی شہادت دیتا ہے اپنے عہدے کے شایانِ شان موصوف نے مرحوم کے کردار کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور موصوف کی نگاہِ دور رس مرحوم کے بحرِ کردار کی تہ میں پنہاں دُر ہائے شہوار تک پہنچ کر انکی آب و تاب سے متاثر نظر آتی ہے۔

"اُردو کے فروغ و ترقی کے حامی تھے"۔ بزمِ ادب تمام تر خانصاحب ہی کی رہینِ منت ہے۔ کارکنانِ بزم کی راہ میں جس قدر مشکلیں پیش آتیں وہ مرحوم کے گرہ کشا ناخنِ تدبیر کے آگے کوئی حقیقت نہ رکھتیں۔ اُردو میگزین ایک مدت سے خوابِ مرگ کی سی غفلت و جمود میں تھا۔ اسی شفیق صدر کی مسیحا نفسی نے اس جسمِ مردہ میں روحِ تازہ پھونکی اور از سرِ نو اسے نئی زندگی بخشی۔ سال بسال پیش آنے والی دقتوں کو خوبی سے حل کیا، اُردو خواں طلبہ پر نظامِ ادب کا چندہ لازمی قرار دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رسالہ کی بقا کی صورت پیدا کر دی۔ مرحوم رسالہ کی طباعت و اشاعت میں اتنی دلچسپی لیتے تھے کہ معتمد کو علاوہ اُن امور کے جو در اصل معتمد ہی کے فرائض ہوتے ہیں، اور اسکی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں، دیگر حیثیت گھٹا دینے والے دھندوں سے قطعی نجات مل جاتی تھی۔ اُن کو کامل احساس تھا کہ میں ادبی مقام پر رہ کر اُن گتھیوں کو بہ آسانی سلجھا سکتا ہوں جس کو کسی اور شخص کے لئے بہ حیثیت معتمد یا مدیر سلجھانا مشکل ہے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ مرحوم بہ ظاہر ادبِ انگریزی ہی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہوئے بھی رسالۂ اُردو کیلئے

؎۱۔ اس مضمون یا رسالہ میں جن کارناموں کا جا بجا ذکر کیا گیا ہے انہیں کو خانصاحب کی زندگی حاصل سمجھ لینا سخت غلطی ہوگی خانصاحب کی زندگی کے بہت سے قابلِ رشک پہلوؤں اور اُن بہت سے کارناموں کو ابھی ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا اور وہ پوری طرح قید تحریر میں آ ہی نہیں سکتے۔

اس احساس درد اور توجہ سے کام کرتے تھے گویا رسالے کو کوئی نقصان پہنچ جائے گا تو خدانخواستہ اُن کے دین و ایمان ہی کو ٹھیس لگ جائے گی۔ یہاں اُن احسانات کی تفصیل کی گنجائش نہیں جو مرحوم نے بزمِ ادب پر کیے، وہ لاتحصیٰ ولاتعد ہیں۔

جناب سجاد مرزا صاحب ایم اے کنٹب پرنسپل عثمانیہ ٹیچرز ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن کا جو مرتبہ اہلِ ملک میں ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے ہے اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے استاد مرحوم کے طریقۂ تعلیم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ استناد کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک موقع پر مرزا صاحب نے مرحوم پر اعتراض کیا، ان کے نقص کو بتایا اور صحیح طرزِ تعلیم کی طرف توجہ دلائی تو جس خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے مرحوم نے اپنے شاگرد کی تجاویز کو قبول کیا، اس نے شاگرد کے دل پر اُن کی عظمت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ علی الاعلان بے باکی سے ایسی تجویز پیش کرنے والے شاگرد کو اپنی ملامت کا ہدف اور عتاب کا مورد بنالیتے۔ ایسے "گستاخ طالب علم" کو خاموش کر دیتے یا تجویز ہی کو مہمل قرار دیتے، اور کچھ نہیں "دینی ٹلونگ انڈین" ہی کا لقب کیا برا تھا؟ لیکن اُن کی غیر معمولی رفعت نے اُن کے دل میں یہ ذلیل خیال ہی آنے نہ دیا کہ یہ طالب علم اپنی بزرگی منوانے اور میری حیثیت کو گھٹانے کی خاطر ایسی تجویزیں پیش کر رہا ہے بلکہ انہوں نے نیک نیت اور پرخلوص آدمی کی طرح اپنے شاگرد کی تجویز کو نیک نیتی او رخلوص پر محمول کیا اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ اگر خاں صاحب میں کوئی باطنی کمزوری ہوتی تو وہ اپنے شاگرد کی اس جسارت کو طرح طرح کی باتوں پر محمول کرتے اور ہزار طرح اسے موردِ الزام ٹھہراتے حتیٰ کہ اس کی خوشحالی کے درپے ہو جاتے لیکن وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں ایسے بلند مرتبہ پر ہوں جہاں اس قسم کے خیالات بھی خلافِ شان ہوتے ہیں۔ میرا رتبہ ایک شفیق باپ کا ہے کسی جبیرتی حاکم کا نہیں۔ میرا کام تعمیر ہے تخریب نہیں میرا مسلک ہے ؎

روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

ایک دردمند جس کے آگے ٹامس آرنلڈ کی سی روشن مثال شمعِ ہدایت کا کام کر رہی ہو جس کے مقاصدِ تعمیر کردارِ طالب علم کی سود و بہبود، جہالت کی بیخ کنی اور علم کی ارتقا ہو وہ سمجھتا ہے کہ میرا کام زندگیوں کو بنانا، رُوح کو سنوارنا، عقل کو آراستہ کرنا، آزادی کی رُوح پھونک کر آزاد خیال اور بے باک بنانا ہے۔ اپنے رعب کی خاطر ہر چھوٹی بڑی بات پر زجر و توبیخ کر کے اُن کے دماغوں کو مسخ کر دینا، بزدل، محدود خیال، پراگندہ رُوح اور کمزور خیال بنا دینا نہیں ہے۔ میرا مقصدِ حیات حکومت نہیں خدمت ہے۔

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا صاحب نے اپنی طرزِ خاص میں مرحوم کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے

گویا خاں صاحب پھر ایک بار کالج کی فضا میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ آگئے۔ آغا صاحب نے مرحوم کی جن خاص خاص باتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ آغا صاحب کی قوتِ مشاہدہ کی بہت اعلیٰ مثالیں ہیں۔ مرحوم کی باوقار چال، پہلی گرج، نرم گفتگو، معنی خیز خاموشی، غیر ضروری باتوں سے احتراز، لباس کی نفاست، خوبصورتی سے سجے ہوئے کالے کالے بال، آنکھوں کی مسکراہٹ سب کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے۔

آغا صاحب نے کالج کے مشاعروں سے مرحوم کی دلچسپی کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہایت قابلِ غور ہے۔ یہ حقیقت اس امر کی شاہد ہے کہ مرحوم کی نگاہِ نکتہ رس ہر ایک شئے کی سطح سے گزر کر اس کی تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ اور ان کا دور رس دماغ حقیقت اور ماہیتِ کار سے وقوفِ کاملہ حاصل کرلیتا تھا۔ اسی ذہنِ رسا، مطالعہ اور علم کی بنا پر وہ مشاعروں کی اہمیت کو جانتے تھے۔ مرحوم ان سطح بینوں میں سے نہ تھے جو چیزوں کو محض اس وجہ سے پسندیدگی یا نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ایسا کرنا نئی روشنی کا تقاضا ہے یا داخلِ فیشن ہے، یا عوام کے خیالات کے مطابق ہے۔ یہ واضح رہے کہ ہر مسئلہ میں خواہ وہ کوئی ہو خاں صاحب دقائق کی حد تک جانچ پڑتال کرلیتے اور اس کے بعد اس کے متعلق ان کی ایک مستقل ذاتی رائے ہوتی تھی[1] اگرچہ انھیں زبانِ اردو پر قدرت حاصل نہ تھی مگر اردو کی فلاح و ترقی کے مسائل پر پورا پورا عبور تھا۔ وہ اردو زبان و ادب کی بنیاد اور اسے پروان چڑھانے کے موثر طریقوں سے واقف تھے، انہوں نے معلوم کرلیا تھا کہ اردو کی ترقی کا راز اس کے کامیاب مشاعروں میں پوشیدہ ہے۔

یوں تو ان تمام بیانات میں جو مجھے وصول ہوئے ہیں خاں صاحب کی شفقت، علمی قابلیت، حسنِ انتظام، بلند کرداری، اعلیٰ کارکردگی کا بہت موثر الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ نے مرحوم کی ایک خاص حیثیت پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صاحب دکن کے سب سے سرگرم علمی کارکن ہیں۔ موصوف صرف نظریہ باز عالم ہی نہیں بلکہ میدانِ عمل کے یکہ تاز بھی ہیں۔ ایسے کارکن کا کسی کو کارکن کہہ دینا سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک اور خصوصاً ادب و تاریخ دکن کی جو گوناگوں خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے کام کا بیڑا اٹھایا اور پُرخلوص خدمت کی ٹھان لی اور لائحۂ عمل اور نصب العین کے ترتیب و تعین کے بعد میدانِ عمل میں گامزن ہوئے تو انھیں کھوٹے کھرے کا اندازہ ہوگیا اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ان پر عیاں ہوگئی کہ کام کا ڈھول پیٹنے والے، گو مصروف کار و گو مصروف بے کار نظر آنے والے، جن کے اجلاس پر پہروں داخلہ نہیں ملتا، جنہیں موٹر پر سے گزرتے ہوئے بھی اخبار بینی سے فرصت نہیں ملتی، جن کی آمد و رفت کی اطلاع اخباروں میں جلی حرفوں میں شائع کی جاتی ہے، ان کا سرمایہ حسنِ عمل سے یک قلم پاک ہے۔ اور وہ کہہ اٹھے کہ صدقک یا ایہا الشاعر۔

اے طبل بلند بانگ کہ اندر تو ہیچ است

---

[1] ملاحظہ ہو دیوان بہادر آر۔ وامودو آئینگار صاحب کا مضمون صفحہ (۸)

اور ساتھ ہی ساتھ اُن کم آشنا جلسوں اور دعوتوں سے گریزاں، نام و نمود کے موقع پر خارج از بحث نظر آنے والوں کے بارے میں بھی اندازہ ہوگیا جو اپنی خاموشی میں گہرائی اور گہرائی میں گہرہائے آبدار پنہاں رکھتے ہیں۔ بظاہر خاموش بباطن مصروف و سرگرداں۔ اُن کے بازو کی قوت، اُن کے دل و دماغ کا بہترین جوہر اُن کا کثیر سرمایہ اُنکی اعلیٰ صلاحیتیں، اُن کے وقت کا بہترین گنجینہ سب کے سب روز و شب بنیادی اور تعمیری کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ان ہی چند شاذ ہستیوں میں خاں صاحب مرحوم کی ہستی ایک شانِ امتیاز لیے ہوئے نظر آئی۔

جناب قائدِ الملک غلام احمد کلامی صاحب صدر مجلس اسلامیہ بنگلور کا رتبہ خادمانِ دین میں جو کچھ ہے وہ سب پر ظاہر ہے، مسلمانوں میں اس وقار کے آدمی بہت کم ہیں۔ اب تک تو آپ نے ایک معتقد رئیس، ایک رکنِ کونسل، ایک معبرِ اخلاق، ایک شاگرد، ایک ماتحت، ایک سرگرم علمی کارکن، ایک ماہرِ تعلیم کی آنکھوں سے مرحوم کی شخصیت کو دیکھا ہے۔ آیئے اب مسلمانوں کے ایک ذی مرتبت قائد کی نظروں سے خاں صاحب کو دیکھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ حیدرآباد سے باہر اسلامی دنیا میں مرحوم کا کیا رتبہ تھا۔

جناب محمد اکرم اللہ صاحب ڈپٹی کمشنر ریس حیدرآباد دکن کے مکتوب کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اُس استاد کا کیا کہنا جس کے شاگرد اُسے ان الفاظ میں یاد کریں۔ مرحوم نے اپنے کردار کو ایسا بنایا، اپنی شخصیت کو اس قدر بلند کیا، اپنی مہربانیوں اور کرامتوں کو اس قدر وسیع کر دیا کہ اُن کے بعد اُن سے ملنے والے اور شاگرد آزادی اور جرأت کے ساتھ اُن کا شاگرد یا اُن کا جاننے والا ہونے پر فخر کرتے ہیں، ان کی رحلت سے دردناک ہیں، اور جب ان کا ذکر آتا ہے تو اچھے الفاظ میں انھیں یاد کرتے ہیں۔ خاں صاحب نے دلوں پر محبت کی بھی گردنوں اور سروں پر نہیں۔ انھوں نے دلوں میں ایسی عزت پیدا کی تھی کہ ان کا ایک عالی مرتبہ سا شاگرد بھی اپنے آپ کو اُن کا تلمیذ کہنے میں ایک طرح کا فخر محسوس کرتا ہے۔

اہلِ فکر اور اربابِ نظر ہی سمجھ سکتے ہیں کہ خاں صاحب کے ایک جملہ میں پند و نصائح کے وہ بے پناہ دفتر پنہاں ہوتے تھے جن کا صحیح اندازہ کچھ اس پر عمل کرنے والے ہی کو بخوبی ہوسکتا ہے۔ اس حکیم دانشمند کی طرح جو اصل مرض کو سمجھ کر دیگر عوارض سے توجہ ہٹا لیتا ہے اور اصل مرض کے استیصال کی تدبیر و فکر کرتا ہے۔ مرحوم نے نصیحت میں فن و عادات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ ایسی نصیحت کر گئے جو ہر موقع پر ہر شخص کے لئے شمعِ راہ ثابت ہوگی۔ عام طور پر اصحاب مشفق صرف اپنی قوتِ تقریر اور بزرگی دکھانے کے موقع کو غنیمت جان کر مخاطب کے مزاج و حالات پر اپنی دانشمندی

اور بزرگی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں اور اس کی پریشان حالی سے ایک ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسی نصیحت مخاطب کو نادم اور اس کی ہمتوں کو پست کر دیتی ہے اور وہ ناصح کے سامنے اپنے آپ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگتا ہے بلکہ واہمۂ کمتری اپنے ساتھ ساتھ واپس لے جاتا ہے

خاں صاحب کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسی نصیحت نہیں کی جس سے مخاطب کی پریشانیوں میں مزید خفت کا اضافہ ہوتا بلکہ ان کی جامع نصیحت زیرِ لب مسکراہٹ کی آمیزش سے خوشگوار اور مخاطب کی نصف مصیبتوں کو کم کرنیوالی ہوتی تھی۔ جس سے سننے والے کو معاً سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

سیّدہ احمد النسا بیگم صاحبہ کے مضمون سے خاں صاحب کی نجی زندگی پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ جن کی پبلک زندگی جس قدر درخشاں اور تابناک ہوتی ہے اسی قدر ان کی نجی زندگی شرمناک اور ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ خاں صاحب ہی کی ایک ہستی نظر آتی ہے جو عوام میں ہر دل عزیز ہونے کے باوجود ان خامیوں سے پاک وصاف رہی جو انہیں نجی فرائض سے غافل اور اپنے خاندان میں غیر ہر دل عزیز بنا دیتی مرحوم کی نجی زندگی دراصل ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

شہنشاہ بیگم صاحبہ ایم اے ہماری درسگاہ کی ایک قابلِ فخر ہستی ہیں جن پر نظام کالج بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ امتحان ایم اے دسمبر ۱۹۴۳ء میں آپ کی درخشاں کامیابی پورے جامعۂ مدراس کی درسگاہوں کے لئے مایۂ صد افتخار ہے۔ موصوفہ کی سال بہ سال کی امتیازی کامیابیاں مخلوط تعلیم کی کامیابی پر دال ہیں۔

مخلوط تعلیم کو کامیاب بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ قادر حسین خاں مرحوم نے تعلیمِ نسواں کی ترقی کی طرف جو غیر معمولی قدم بڑھایا ہے وہ ان کے دیگر کارناموں کی طرح گوشۂ گمنامی ہی میں رہا جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے ایک طالبہ نے جو بزمِ انگریزی کی رکن بھی تھیں یہ الفاظ کہے تھے جو یقیناً قابلِ توجہ ہیں "اپنے شفیق اور ہمدرد صدر کے اوصاف کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا ذکر تو سب ہی کریں گے لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مرحوم نے تعلیمِ نسواں کی ترقی کے لیے جو قدم بڑھایا ہے وہ ان کو دیگر ماہرینِ تعلیم سے ممتاز کرتا ہے۔ مرحوم کا یہ اقدام عدیم المثال ہے اور تاریخِ تعلیمِ نسواں میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا"

جناب پی محمد ابراہیم صاحب متعلم اسلامیہ کالج وانمباڑی کا مضمون دور دراز کی طلبہ برادری کی ایک طلبہ پرور کی موت پر احساسات کا اچھا ترجمان ہے۔ یہ مضمون ہمیں مرحوم کی ان علمی خدمات سے بھی واقف کراتا ہے جو انھوں نے قوم کی صلاح و فلاح کے لئے بیرونِ حیدر آباد انجام دی ہیں۔

جناب قاضی محمد زین العابدین صاحب ایچ، سی، ایس نظام کالج کے ایک ممتاز اور سابق طالبعلم ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف کو ان مرحوم کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے۔ قاضی صاحب نے خاں صاحب مرحوم کا قطعۂ تاریخ بہت خوبی سے نظم کیا ہے۔

قطعۂ تاریخ کے مصرعۂ اولیٰ میں اس حقیقت کی طرف ایک شاعرانہ اشارہ ہے جس کی طرف آغا حیدر حسن صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں لطیف اشارے کئے ہیں اور شہنشاہ بیگم صاحبہ نے بھی (صفحہ ۳۳۵) پر کھلے لفظوں میں اس طرف توجہ دلائی ہے اور شیخ ابو محمد مصلح صاحب اس سے بہت قریب آکر چپ ہو گئے ہیں۔ ناظرین اگر ان صفحات سے کوئی بات اخذ کر سکتے ہیں تو وہ معلوم کر لیں گے کہ خاں صاحب دراصل "مظلوم" کہلانے کے کتنے مستحق ہیں۔

یہ حقیقت اس قدر عام تھی کہ کسی نے اس کو صراحت سے لکھنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ایک پرانے بزرگ کا جو حیدرآباد کے سررشتۂ تعلیمات و عدالت کی اعلےٰ کرسیوں کو زینت بخش چکے ہیں۔ یہ مقولہ مشہور ہے کہ حیدرآباد میں جو شخص جتنی زیادہ محنت و دیانت سے کام کرتا ہے وہ اتنا ہی مخالف پروپگنڈے کا شکار ہوتا ہے۔ یہ مقولہ قادر حسین خاں صاحب کی زندگی اور موت پر بالکل صادق آتا ہے جن کو فرض شناسی اور محنت نے ضعیف کر دیا تھا اور گمنام خطوط نے بالاخر دل کی حرکت ہی بند کر دی۔ نوجوانان کالج کو ملک و قوم کی خدمت کرنا ہے، ان پر لازم ہے کہ اپنے آپ میں اخلاقی جرأت پیدا کریں اور وہ طریقۂ کار اختیار کریں جس سے گپ باز، گمنام درخواستوں، گمنامیوں اور خفیہ سازشوں کا قلع قمع ہو جائے تاکہ ان کی راست گفتاری سے اس بلا کا سدباب ہو جائے جس کی گردن پر قادر حسین خاں اور قادر حسین خاں جیسی کئی ہستیوں کا خون ہے۔

راقم الحروف کے ذمے چند شکریئے بھی واجب الادا ہیں۔ اولاً جناب اسرائیل احمد مینائی صاحب سابق معتمد نظام ادب شکریہ کے سزاوار ہیں جنہوں نے مدالیار صاحب، آر وامودو آینگار صاحب، م۔ ن۔ کورلا والا، ترناسوامی صاحب کے پیامات تلیس اور ٹکسالی زبان میں ترجمہ کر کے زبان اردو پر اپنی قدرت کاملہ کا ثبوت دیا۔

ہم بطور خاص نواب احمد یار جنگ بہادر کے بھی ممنون احسان ہیں جن کی حسن توجہ کی بدولت یہ رسالہ عیوب بدرنگی کے داغ کو ڈھانپنے کے قابل ہو سکا۔

آخر میں، ادارہ صدر کلیہ جناب سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب، ڈاکٹر زاہد علی صاحب، پروفیسر احمد عبداللہ صدیقی صاحب صدر شعبۂ اردو نظام کالج، پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا صاحب استاذ اردو، مدیر "نظام ادب" کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

قاضی احمد بشیر الدین

معتمد

قطعۂ تاریخِ رحلت

از نتیجۂ فکر جناب قاضی محمد زین العابدین صاحب عابد بی ایس سی سابق طالبعلم نظام کالج

کارہا کرد و طعنہ ہا بشنید
وائے بر جانِ پاکِ آن مظلوم
عابدا خستہ بے سر شید آہ
۱۶
گفت قادر حسین خان مرحوم
۱۳۷۸ - ۱۶ = ۱۳۶۲ ہجری



قادر حسین خان مرحوم
سابق صدر کلیہ نظام۔ حیدر آباد

حیدرآباد دکن

مسٹر قادر حسین خاں مرحوم نے خصوصیت کے ساتھ نظام کالج
کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی طرح بھلائی نہیں جاسکتیں۔
مرحوم اپنے اعلیٰ کردار سے اپنے احباب میں مخلص اور طلباء کے لئے
ہردلعزیز و شفیق استاد تھے۔ جن کی بے وقت موت نے درس و تدریس
کیلئے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جس کا افسوس ہے۔ فقط

سالار جنگ

۲۲ر جمادی الاول سنہ ۱۳۶۳ھ

خاں صاحب کی موت ابدی زندگی ہے

پیامِ خصوصی

اس عالم میں انسان کی آمد کے اولین مقاصد۔ اجزائے عالم کی پہچان۔ اپنے بیگانوں سے محبت اور خدمت خلق ہیں۔ وہ فرائض شناس ہستیاں جن کی زندگی خدمت خلق میں گذری جن کے اوقات زندگی ملک اور قوم کے ہونہاروں کو سنوارنے میں صرف ہوئے۔ ان کی زندگی بہترین زندگی اور اُن کی موت ابدی زندگی بنجاتی ہے۔ ان کا نام صفحۂ دنیا سے کبھی مٹتا نہیں۔

انھیں پرجوش قوم پرست ہستیوں میں قادر حسین خاں مرحوم کی بھی ایک جلیل القدر ہستی تھی جس پر نظام کالج کو جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔ مرحوم انتہائی حد تک ابنائے ملک کی خدمت میں مصروف تھے۔ انھوں نے پرنسپل نظام کالج کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک لائق شفیق مربی کی حیثیت سے نظام کالج کے طالب علموں کو سنوارا۔ علم و ہنر سے ایسا روشناس کیا کہ حیدرآباد کے کالجوں میں ایک بین امتیاز قایم ہوگیا۔ چنانچہ نظام کالج کے نتائج بیحد اطمینان بخش اور لائق تحسین نمودار ہوتے رہے۔ انھیں اپنے فرائض سے ایسی دلچسپی تھی کہ پوری مدت ملازمت میں انھوں نے کبھی رخصت نہیں لی بلکہ تعطیلات میں بھی کار مفوضہ کی انجام دہی ان کا شیوہ رہا۔ افسوس ہے کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ ان کے بے وقت انتقال سے خصوصیت سے نظام کالج اور عمومیت کے ساتھ حیدرآباد کو نقصان عظیم پہنچا۔ نظام کالج انھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔

خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندوں کو صبر جمیل دے۔

دھرم کرن

۶ ر آذر

مغرب اور مشرق کی ایک خوشگوار پیداوار

مکرمی

حواله — آپ کا مکتوب مورخه ۱۹؍ اپریل ۱۹۴۴ء

قادر حسین خانصاحب مرحوم نے نظام کالج اور نظام کالج کے طلباء کیلئے جو کچھ کیا اسکا صحیح اندازہ و احساس طلباء ہی کو ہو سکتا ہے۔ وہ ایک خاموش لیکن سوچنے والے بہ ظاہر سخت لیکن رحم دل انسان تھے۔ وضع قطع مغربی لیکن مشرقی روایات کے دلدادہ۔ انگریزی انکا اوڑھنا بچھونا لیکن اردو کے فروغ و ترقی کے حامی۔ الغرض اگر انھیں مغرب اور مشرق کے امتزاج کی ایک خوشگوار پیداوار کہا جائے تو غالباً بڑی حد تک صحیح ہوگا۔ طلباء سے وہ خاص ہمدردی رکھتے تھے اور انکے دکھ درد کو ایک شفیق باپ کی طرح اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ پروفیسر سے پرنسپل نظام کالج میں انکی سرگزشت درس و تدریس کے میدان میں ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جو بہت سوں کیلئے قابل رشک ہے۔ مرحوم ایک اچھے اہل قلم تھے اور مسلم ثقافت و تمدن سے انکی گہری دلچسپی مختلف مواقع اور رسالوں سے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے کچھ دنوں ناظم معلومات عامہ کی حیثیت سے بھی ملک کی خدمت انجام دی۔

قادر حسین خاں صاحب کی موت سے یقیناً نظام کالج کو بڑا نقصان پہنچا خدا انکی روح کو غریق رحمت کرے اور انکی یاد انکے طلباء کے دلوں میں تازہ رکھے۔ فقط

مخلص

رحمت یار جنگ

علم و فضل

امین منزل حیدرآباد
۱۳ر تیر ۱۳۵۲ف

کرم فرما جناب قاضی محمد بشیر الدین صاحب معتمد "نظامِ ادب" دام کرمہٗ

مراسلہ مورخہ ۱۱ر اپریل سنہ ۴۳ ۱۹ء کا شکریہ —

میں پرنسپال قادر حسین خاں مرحوم کو اس وقت سے جانتا تھا جبکہ اُنکے بھائی اسد اللہ صاحب کی شادی میرے ہمعصر اور ہم پیشہ دوست وکیل ہائیکورٹ مدراس سید نظام الدین صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ پٹھان تھے لیکن بہت سلیم الطبع و حلیم المزاج آدمی تھے۔ اُنکا علم و فضل سونے پر سہاگہ تھا۔ خدا انکو غریق رحمت فرمائے بڑے خوبیوں کی ہستی تھی۔

سر احمد حسین امین جنگ

خاموش شخصیت

ڈاکٹر اے ال۔ مدلیار
ام ڈی، اف آر سی او جی۔ اف، اے سی یس
عمید طب جامعہ

عمارات جامعہ
ٹریلیکین
مدراس

قادر حسین خاں مرحوم کی اچانک رحلت کی خبر سے اُن کے بہت سے دوستوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ چونکہ ہم اُن سے متعلق تھے اور جامعہ مدراس میں ان کی مختلف سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھے اس لئے یہ صدمہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ ہے۔

میں اور قادر حسین خاں مرحوم مدراس کرسچین کالج کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد اتفاق آج سے تقریباً پندرہ برس اُدھر پھر دیکھنے کا اتفاق ہوا اور مجھے جامعہ کے دوسرے عہدہ داروں کے ساتھ سنڈیکیٹ کے رکن کی حیثیت سے اُن سے دوبارہ ملاقات کا موقعہ ملا۔ تھے خاموش اور خلوت پسند اس لئے سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے اُن سے میل ملت بڑھائی عوام کی نظروں میں نہیں آتے تھے لیکن جو لوگ ایک مرتبہ اُن سے واقف ہوجاتے وہ یہ محسوس کرتے کہ اِس خاموش شخصیت میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ درس گاہ کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ انتظام کرنے والے افسر کی حیثیت سے بہت کم لوگ اُن کے مدمقابل ہوسکتے تھے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ درس وتدریس میں ایک ایسے استاد کی حیثیت سے جسے اپنے طلباء کی بہبودی سے حقیقی معنی میں دلچسپی تھی وہ ایک نہایت اچھی مثال قائم کرگئے۔

مرحوم کی موت سے نہ صرف نظام کالج حیدرآباد بلکہ جامعہ مدراس کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اِس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو میرے لئے معتمد نے فراہم کیا ہے مرحوم کی خدمت میں نذر عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ خداوندکریم اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مدالیار

میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں

پرنسپل قادر حسین خاں کی موت پر دور اور نزدیک ہر جگہ صفِ ماتم بچھ گئی۔ مرحوم نے اپنے کالج کے معاملات اور باہر کے امور میں کچھ ایسا حصّہ لیا جس سے ہر طالبعلم کو اِس کیفیت کے جاننے اور اِس تفصیل کے سمجھنے کا پورا پورا حق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ انسان تھے تو کس قسم کے، طالب علم تھے تو کیسے اور ایک مرتاض کی زندگی کیونکر بسر کی۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کی زندگی کا طرزِ عمل گہری تنقید اور نکتہ چینی کے مقابلہ میں مرحوم کی راہ و روش کی بہ نسبت بہتر طور پر ٹھہر سکے۔ اخلاقی اور دنیوی قوانین کی تمام اہم راہوں کو انھوں نے ہمیشہ اس طرح طے کیا کہ اُن کے دامن پر کوئی دھبّہ نہیں آنے پایا۔ جلد بازی کا کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوا جس پر ندامت ہوئی ہو اور نہ اُن کے قدم کسی دباؤ کے تحت ایک لمحے کے لئے بھی اپنے مخصوص اور مقررہ راستے سے ہٹے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہی مراد بھی لے رہا ہوں کہ مرحوم کو اپنا راستہ سب سے الگ نکالنا تھا اور جب پیشہ کا انتخاب کرلیا تو پھر انھوں نے اپنی روزی کمانے کے لئے ہر دلعزیزی یا شہرت پر۔ جو تلون کی دیوی کی مثال ہے۔ کوئی بھروسہ نہیں کیا۔ انھوں نے روزی نہ صرف اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کمائی بلکہ اُس میں ایسے بے نوا ضرورت مند کا حصّہ بھی تھا جن کی ایک بڑی تعداد نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ ریاست کے باہر بھی تھی۔ مرحوم نے ایسا جملہ نہ تو کبھی کہا نہ اُن کے قلم سے نکلا جس کی سچائی کا خود انھیں پوری طرح یقین نہ ہو۔ گو انھیں اِس بات کا احساس تھا کہ وہ عوام کی صلاحیتوں سے زیادہ بلند صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن انھوں نے کبھی نہ دوسروں کو گھٹانے اور نہ اپنے آپ کو بڑھانے کی کوئی کوشش کی۔

نرم دلی اور شفقت مرحوم کی خصوصیات تھیں۔ اُن کی کمزوریاں ۔ زود رنجی اور افسردگی۔ جن کی وجہ سے

وہ بعض اوقات ایک زندہ دل اور خوش طبع ساتھی نہیں بن سکتے تھے۔ ایک تو اُن کی خاص افتادِ مزاج اور حساس طبیعت اور دوسرے اپنے کام میں اُن کے کامل استغراق اور اس عزم کا نتیجہ تھیں کہ کام کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دیا جائے اس جذبہ کی آگ اُن کے عالی منش باطن میں اپنی پوری تنویر کے ساتھ روشن رہی۔ یہ سچا جذبہ ہر اچھائی اور اچھی چیز سے محبت کرتے اور ہر برائی اور بری چیز سے نفرت کرنے کا تھا اس سے بڑھ کر اور میں کیا کر سکتا ہوں کہ اخیر میں چند وہ شعر جو اُنھیں بہت پسند تھے نقل کردوں۔

نہ خورشید کی تابِ تب پر نظر کر
نہ سرما کی بے مہریوں سے خطر کر
ہوا کام پورا صِلہ نیک پایا
اب آرام سے زیرِ مدفن گزر کر
زن و مرد کو جان کھونا ہے آخر
ہمیں مثلِ گل خاک ہونا ہے آخر

خدا حافظ

کورلا والا

مرحوم کا نام یادگار رہے گا

دیوان بہادر آرموداوآینگار۔ بی اے بی ال
سینیر اڈوکیٹ فیڈرل کورٹ

امرت نواس
حیدرآباد۔ دکن

میں نے پروفیسر قادر حسین خاں مرحوم سابق پرنسپل نظام کالج کی موت کی خبر کو نہایت گہرے رنج کے ساتھ سنا۔ گو میں اُن کو کمیٹی اصلاحات کے رکن مقرر ہونے سے پہلے بھی جانتا تھا لیکن اُن سے گہری ملاقات اصلاحات کی کمیٹی میں شریک کار بننے کے بعد ہی ہوئی۔ مرحوم کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ ایسے عام سوالات کے بارے میں جو اُن کے کام سے متعلق نہ ہوں اپنی ذاتی رائے اور خیالات رکھتے تھے۔ تامل زبان بہت اچھی طرح بول سکتے تھے۔ نظام کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے وہ کالج میں داخلوں کے معاملے میں ایک حد تک سخت سمجھے جاتے تھے لیکن میں اپنی ذاتی معلومات کی بناپر کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے صحیح معنی میں کسی مستحق کو داخل کرنے سے انکار نہیں کیا۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ انھیں اس معاملہ میں مجبوراً سختی کرنا پڑتی ہے اس لئے نہیں کہ وہ صرف سختی کرنا چاہتے تھے بلکہ کالج کی گنجایش داخلہ چاہنے والے تمام طلباء کے لئے کافی نہیں تھی۔ اُن کو اس بات کا بے حد خیال رہتا تھا کہ نظام کالج کا معیار گھٹ نہ جائے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ نظام کالج کا جامعہ مدراس سے تعلق کالج کے لئے بہت مفید ہے۔ اور یہ کہ کالج کی اس ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے جو اس نے جنوبی ہند کے کالجوں میں حاصل کرلی ہے اس تعلق کو باقی ہی رہنا چاہئے۔ قادر حسین خاں مرحوم کی موت سے کالج کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم کا نام ایک ایسے پرنسپل کی حیثیت سے جنھوں نے اپنے محبوب کالج اور اس کے مفادات کی پوری پوری خدمت کرنے کی کوشش کی عرصہ تک یادگار رہے گا۔

آرموداوآینگار

میرے استاد اور دوست

کسی شخص کی حقیقی قدر و قیمت۔ سماج میں اس کا درجہ اور بنی نوع انسان میں اس کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسکی زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے اور اسکے زمانہ کے ماحول کی مناسبت سے انکی جانچ پڑتال کیجائے۔ ہمارا یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ اکثر اوقات ایک ہی شخص بہ حیثیت بہترین استاد، بدترین باپ نہ بحیثیت بہترین عہدہ دار۔ بدترین شوہر، اور بہ حیثیت بہترین دوست، بدترین انسان ثابت ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص مختلف حیثیتوں میں یکساں عمدہ ہو۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے قادر حسین خانصاحب مرحوم کو ایک سے زیادہ حیثیتوں میں دیکھنے اور انسے میل جول رکھنے کا موقع ملا ہے۔ سب سے پہلے میں نے ان کو ۱۹۲۶ء میں ایک نوجوان اور نو مامور لکچرار زبان انگریزی کی حیثیت میں دیکھا جبکہ میں نظام کالج کے تھرڈ ایر میں شریک تھا۔ موصوف ہماری جماعت کو والٹر پیٹر کی کتاب رینا سانس پڑھاتے تھے۔ غالباً آپ جانتے ہیں کہ اس کتاب میں یورپ کے بڑے بڑے مصوروں کی مشہور تصویروں پر تبصرہ ہے۔ ایک ستم ظریفی یہ تھی کہ نہ کتاب ہی میں کوئی تصویر دیگئی تھی جس کا اس میں ذکر تھا اور نہ ہمارے استاد نے ہی ان تصاویر کو دیکھا تھا موصوف کو اس کتاب کے پڑھانے میں جو مشکل ہوتی تھی اس سے زیادہ ہم طالب علموں کو اسکے سمجھنے میں تھی۔ بہر حال وہ بچارے پڑھاتے تھے اور ہم برائے نام ہی صحیح پڑھتے تھے لیکن کیا مجال کہ بیزاری کے آثار کا اظہار ہو سکے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ تھری کاسل سگریٹ کے ڈبے میں ایک تصویر نکلی جس کا بیان اس ناموزوں کتاب میں موجود تھا۔ تصویر دیکھتے ہی اس کتاب کا متعلقہ بیان آئینہ کی طرح صاف ہوگیا اور میری سمجھ میں آگیا۔ اب کیا تھا دوسرے دن جماعت میں ہم نے سب پر خوب رعب گانٹھا لیکن پھر آگے شٹو نہ چلا۔ مجبور ہو کر ہم نے مرحوم سے کہا۔ جناب یہ کتاب تصاویر سے متعلق ہے۔ جب تک ہم کو

آپ تصویریں نہ دکھائیں گے ہم خاک نہ سمجھیں گے۔ میری اس درخواست کا بجلی کا سا اثر ہوا اور مرحوم دوسرے روز کتبخانہ آصفیہ سے تصویروں کا البم لائے اور اس دن سے مجھ سے دوستانہ برتاؤ کرنے لگے۔ اس واقعہ سے مجھے اپنی ذکاوت ظاہر کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ مرحوم کی فراخدلی اور شرافت نفس کا ثبوت دینا ہے۔ ایسے کتنے استاد ہیں جو اپنے کسی طالبعلم کی کسی معقول تجویز کو اس طرح ہنسی خوشی قبول کرتے ہیں؟

۱۹۱۹ء میں میں کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ پیٹرس کالج کے کرہ میں بیٹھا ہوا ایک کتاب دیکھ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قادر حسین خانصاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کو انگلستان[1] پھر کیمبرج میں بلا اطلاع آئے ہوئے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ صاحب سلامت کے بعد فرمانے لگے۔ بھئی میں کیمبرج میں شریک ہونے آیا ہوں۔ سیٹن صاحب[1] نے کہا ہے کہ تم آسانی سے میرا داخلہ کرادو گے۔ بہرحال ان کی جو خدمت ہوسکتی تھی وہ کی گئی۔ وہ بجائے کیمبرج کے آکسفورڈ میں داخل ہوئے لیکن ان کی اور میری حیثیت عجیب ہوگئی تھی۔ میں یونیورسٹی کے سینیر طالب علموں میں تھا اور وہ جونیر یعنی ریفریشر تھے۔ انگلستان میں جونیر سینیر کا ادب لحاظ کرتے ہیں۔ اور میں دیکھتا تھا کہ مرحوم جب ملتے اسبات کو ملحوظ رکھتے جس سے مجھے خجالت ہوتی تھی جب ٹیچر ٹریننگ کے لئے لندن میں مقیم تھا تو تعطیلات میں وہ بڑی پابندی سے میرے ہاں ہر اتوار کو آیا کرتے تھے۔ بعض ناکامیوں کی وجہ سے وہ بڑے پژمردہ اور پریشان نظر آتے تھے اور ہم لوگ ہر ممکنہ طریقہ سے ان کو ہشاش بشاش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مرحوم انگلستان ہی میں اپنے امتحان میں غلطاں اور پیچاں تھے کہ میں حیدرآباد روانہ ہوکر سررشتہ تعلیمات میں ملازم ہوگیا اور جب تک یہ واپس ہوکر نظام کالج میں حاضر ہوئے میں ترقی کرتے ہوئے اس درجہ پر پہنچ گیا تھا کہ تعلیمی کمیٹیوں میں خاص طور پر رکن بنایا جانے لگا تھا چنانچہ ایچ ایس ال کی اور دیگر کمیٹیوں میں ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ مجھ سے بالکل مساویانہ برتاؤ کرنا پسند کرتے تھے اور اختلاف رائے کی صورت میں میری رائے کو یہ ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نظام کالج کے پرنسپل ہونے کے بعد بھی ان کے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں ہونے پایا البتہ عام طور پر یہ اثر ہونے لگا تھا کہ مرحوم اپنی رائے کے بڑے پکے یا

---

[1] سابق پرنسپل نظام کالج مسٹر سٹ گا ہین۔

بالفاظ دیگر صدیقی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیسے پرنسپل ثابت ہوئے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جس نے نظام کالج میں انگریز کی جگہ لی اور جہاں تک کالج کی وقعت طالبعلموں کے ڈسپلن اور امتحانات کے انتظامات اور نتائج کا تعلق ہے اس میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ مرحوم ضابطے کے بڑے پابند تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مجھے موپلوں کی تاریخ کے متعلق ایک کتاب کی سخت ضرورت ہوئی وہ نظام کالج میں تھی۔ میں نے چٹھی بھیجی کہ فلاں کتاب روانہ فرمائی جائے۔ جواب ملا۔ یہ قاعدہ کے خلاف ہوگا۔ میں نے ٹیلیفون دیا کہ بطور خاص میرے ساتھ رعایت کیجائے۔ میں نہ صرف نظام کالج کا قدیم طالب علم ہوں بلکہ سررشتۂ تعلیمات کا درجہ اول کا عہدہ دار ہوں۔ اس پر بھی کچھ نہ چلی تو میں نے چڑ کر کہا "خانصاحب مجھے اس کتاب کی ضرورت ہے۔ براہ کرم آپ اسے اپنے نام جاری کرا کے روانہ کیجئے۔ اس پر وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے تم کو اس کتاب کی کیوں اتنی فکر ہے؟ جب میں نے مطلب کی صراحت کی تو فرمانے لگے فلاں فلاں کتابیں زیادہ مفید مطلب ہوں گی۔ میں نے تعجب سے عرض کیا کہ آپ کو اس تاریخی نکتہ کے متعلق اتنے معلومات ہیں تو فرمانے لگے مجھے بھی تعجب ہوا کہ تم اس نکتہ کی تلاش میں کیسے لگ گئے! مختصر یہ کہ انھوں نے مجھے نہ صرف ایسی کتب روانہ فرمادیں جس کا مجھے علم نہ تھا بلکہ اور بھی کئی مشورے دیکر اپنی استادی کا حق ادا کیا۔

قادر حسین خانصاحب محنتی۔ خاموش اور فرض شناس انسان تھے۔ ان میں مطالعہ کا ذوق تھا لیکن تقریر اور تحریر سے اجتناب کرتے تھے۔ ان میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن وہ اسکے اظہار میں بڑی انکساری سے کام لیتے تھے۔ وہ میل جول کم رکھتے تھے مگر جن سے بھی ان کے ایک دفعہ تعلقات ہو جاتیں تو ان میں بڑا استحکام ہوتا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ نماز روزے کے پابند نہیں تھے۔ عام طور پر انگریزی لباس پہنتے تھے۔ رہنے سہنے کا طریقہ بھی یورپی تھا۔ اسی لئے میں نے ان کے نام کے ساتھ کبھی لفظ "مولوی" استعمال نہیں کیا۔ اس کے باوجود مرحوم ایک اچھے مسلمان تھے۔ ان میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک سچے مسلمان کا اثاثہ شمار ہوتی ہیں۔ صداقت۔ جرأت۔ فرض شناسی علم پروری۔ انصاف پسندی۔ ہمدردی اور رواداری۔ افسوس کہ قادر حسین خانصاحب اچانک

چل بسے لیکن مجھے یقین ہے کہ عرصہ دراز تک ان کی یاد نہ صرف نظام کالج کے احاطہ میں بلکہ اس کے باہر بھی باقی رہے گی ۔

سجاد مرزا

مقطعہ گھٹ کیسر

۲۲/۸ ۳۵ ف

موت و حیات

مرنا جینا ایک ہی جن کو ذرا بھی گیان ہے
وہ ادھر کا مرتبہ ہے یہ ادھر کی شان ہے

زندگی ہے نقص سے معمور! اک مہمل سی بات
موت ہے شیرازۂ قانونِ تکمیلِ حیات

قوت یکسو زندگی مجموعہ اضداد ہے
زندگی ہے وقت کی پابند موت آزاد ہے

زندگی ہے روح کو محدود کر لینے کا نام
موت ہے انساں کے لامحدود ہو جانے کا نام

کہتے ہیں فانی جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

جوش

چل بسے لیکن مجھے یقین ہے کہ عرصہ دراز تک ان کی یاد نہ صرف نظام کالج کے احاطہ میں بلکہ اس کے باہر بھی باقی رہے گی ۔

سجّاد مرزا

متعلم گھٹکیسر ـ

۲۲/۸ ۳ ھ ف

موت وحیات

مرنا جینا ایک ہی جن کو ذرا بھی گیان ہے — وہ ادھر کا مرتبہ ہے یہ ادھر کی شان ہے

زندگی ہے نقص سے معمور اک مہمل سی بات — موت ہے شیرازۂ قانونِ تکمیلِ حیات

قوت یکسو زندگی مجموعہ اضداد ہے — زندگی ہے وقت کی پابند موت آزاد ہے

زندگی ہے روح کو محدود کرلینے کا نام — موت ہے انساں کے لامحدود ہوجانے کا نام

کہتے ہیں فانی جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں — مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

جوش

قادر حسین خاں مرحوم اور میں

یہ مجھے یاد نہیں سن کونسا تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ ولیم ٹرز شیخ دانشگاہ کی قائم مقامی کر رہے تھے اور نواب حیدر نواز جنگ مرحوم مالیہ کی وزارت پر سرفراز تھے۔ میں نے اچھے قد و قامت بھرے ڈیل کا شخص دیکھا۔ رنگ پکا۔ فرنگی جوڑا بحری نیلا زیب تن کئے۔ گردن جھکائے۔ باوقار چال جو غلام گردش میں سے ہوتا ہوا۔ دفتر میں چلا گیا۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا۔ کہ یہ کون ہیں۔ کہا کہ قادر حسین خاں ہیں۔ معاشیات پڑھانے آئے ہیں۔ ایک دن میری انکی مٹھ بھیڑ ہوئی میں نے سلام کیا۔ اچٹتا سا جواب دیکر آنکھیں نیچی کئے چلے گئے۔ برسوں اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز میں برساتی میں کھڑا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم جامعہ مدراس میں اردو کے ممتحن ہو گئے۔ میں نے کہا شکریہ۔ اس روز پہلی دفعہ انھوں نے مجھ سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی اور پورے کوئی دو لمحہ۔ پھر انکو میں نے شیخ دانشگاہ کے اجلاس پر ایک طرف کرسی پر متمکن دیکھا۔ بھلا ویسے تو میں کیوں جانے لگا تھا۔ اللہ کسی کے اجلاس پر نہ لیجائے۔ اجلاس اپنا ہی سب سے بھلا۔ پکڑ بلایا جاتا تھا اور ملزموں کی طرح پیش ہوتا۔ جاتا روتا تھا اور آتا ہنستا وہ زمانہ میرے امتحان کا تھا۔ امتحان کسی جامعہ کا نہیں۔ بلکہ انسانیت اور شرافت کا۔ اللہ نے اس آزمائش میں بھی پائے استقلال کو ڈگمگانے نہ دیا۔ اور اپنی رحمت سے میری عزت کو باقی رکھا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ میری آمد سے بے نیاز بے خبر اپنے الگ کام میں مصروف لیکن میرے سوال جواب انکے دل کے کان سنتے تھے اور میری رخصت کے وقت وہ ہمہ تن ہمدردی نظر آتے۔ پھر دانشگاہ نظام سے دانہ پانی اٹھا۔ اور نوکری کا بکھیڑا باندھ بوندھ نکلنا پڑا۔ ایک سال باہر دانشگاہ شہر کی ہوا کھائی۔ یہاں اتنی ترقی ہوئی کہ ایک اعلیٰ قسم کی ولایتی بتی کھینچنے کو اور دوپہر کو کھانا پیٹ بھر ملنے لگا۔ ایک سال گذرا جس کا ایک ایک لمحہ اس زمانے میں

سولی کا اور اب کل کی بات معلوم ہوتی ہے جو آنکھ جھپکائے میں گزر گئی۔ نظام دانشگاہ کا دانہ پانی پھر کھینچ لایا۔ اب فرنگی کی جگہ کالا نظر آیا جائزہ لینے اجلاس پر گیا۔ ایکے افسری شان سے خانصاحب ملے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں۔ واپس آنے پر مبارکباد دی۔ اب دانشگاہ میں پردیسی راج کے بدلے سوراج راج کر رہا تھا۔ دفتر کا باوا آدم بدلا نظر آیا۔ جو ایک زمانے میں ناک کا بال اور نفس ناطقہ تھے۔ ان کو کونے میں بیٹھا اونگتے دیکھا۔ کام تیزی سے چل رہا تھا کہ گویا دفتر میں کل لگ گئی ہے۔ جو اساتذہ اپنے اپنے ہاتھوں سے پگڑیاں سنبھالے چھپتے پھرتے تھے۔ اب اکڑ اکڑ کر اطمینان سے چلنے پھرنے لگے جو چہرے پہلے سہمے سہمے رہتے تھے وہ ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔ اور جو سروں پر چڑھے تھے وہ جماعتوں میں کرسیوں پر آ بیٹھے۔ یہ کالا افسر نہ لڑکوں کے ہاتھ میں کھلونا تھا نہ اساتذہ کے ہاتھ میں موم کی ناک۔ سب اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کریں۔ آپ بھلے اپنا کام بھلا۔ خانصاحب ہمیشہ فرنگی لباس پہنتے۔ اور بڑے سلیقے سے داڑھی مونچھ کا صفایا تھا۔ اور بال کالے بھوزا ہمیشہ رہتے کبھی یہ نہ دیکھا کہ چیونٹیاں منہ میں انڈے لئے ابل رہی ہیں۔ انکی کم گوئی اور تنہائی پسندی سے کبھی مشرب کا پتہ نہ لگا۔ اتفاق سے اپنے گردش کے زمانے میں ایک معتبر کے در کی خاک چاٹنے گیا۔ ان کو میرے اچھے زمانے میں ارمان تھا کہ کبھی انکے غریب خانے پر بھی جلوہ افروز ہوں۔ اب جو اس کو دولت خانہ سمجھ کر حاضر ہوا۔ فرمایا کہ آپ کے ہاتھوں نہ تو دفتر میں پایا ہے۔ نہ گھر پہ۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ کام کے بعد آرام کچھ تو ملنا چاہئے۔ یہ گھر کہاں میں دم بخود سن رہا تھا۔ سامنے ایک درویش سجادہ پہ بیٹھے نظر آئے اور خانصاحب انکے سامنے دور ہٹے دوزانو ادب سے شیروانی پہنے ترکی ٹوپی اوڑھے دکھائی دئے۔ میں نے پہلی دفعہ ان کو دیسی لباس میں دیکھا تھا لیکن صاحب خانہ کے ہاتھوں میری مشیخت کو خوب اچھی طرح ٹھیس لگ چکی تھی۔ اس لئے اس وقت تو انکے تبدیل لباس کی لذت کو محسوس کیا۔ لیکن جب وہ ذلت کا جھٹکا دور ہوگیا۔ تو حیرت ہوئی کہ یہ کالا صاحب صوفی مشرب۔ اور راسخ العقیدہ ہے۔ پنج وقتہ نماز کا پابند کیا بلکہ تہجد گزار ہے۔ اپنی صدارت کے زمانے میں مجھے مجبور کیا کہ امامیہ دینیات پڑھاؤں۔ میں نے اپنی بے علمی کا عذر کیا۔ بہتیرا انکار کیا۔ لیکن پزیرا نہوا۔ مجبوراً پڑھانی پڑی۔ نتیجہ اچھا رہا۔ بہت خوش ہوئے۔ میں نے پھر عرض کی کہ معذور رکھا جاؤں۔ اور بمشکل تمام انھوں نے مجھے معاف کیا۔ میری اردو دانی کے

قائل تھے ۔ اور قدر فرماتے ۔ میں اپنی کم سوادی کا خیال کر شرماتا ۔ اُردو کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ۔
دانشگاہ کا سالانہ مشاعرہ ہوتا ۔ اس میں ساری ساری رات دیسی لباس پہنے بنفس نفیس رونق افروز
رہتے اور اچھا شعر سمجھتے اور خوش ہوتے ۔ مجھے حیرت ہوتی ۔ میرا مزاج دن میں امیرانہ ہوتا ہے اور اُدھر
سورج ڈوبا اور کسی مزدور کی روح نے مجھ میں حلول کیا ۔ قدامت پسندی پر مجھے ناز ہے لیکن رات کا
مشاعرہ جان پر بنا دیتا ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ یہ رسم بدل جائے اور مشاعرہ دن کو ہونے لگے ۔ صاحب دل
ہنیں جو شب بیداری کے عادی ہوں ۔ شاعر کا کلام آدھی رات کو داروئے بیہوشی کا کام کرتا ہے ۔
پھر مزا کیا رہا ۔ لیکن خانصاحب کمال کرتے تھے ۔ کہ شگفتہ بیٹھے ہیں ۔ نہ جمائیاں ہیں ۔ نہ انگڑائیاں ہیں ۔
نہ آنکھیں ہی ان کی کڑواتیں ۔ خانصاحب کو اپنے ہاتھ کا کام پسند تھا دوسرے کے سپرد کرنے میں
انکا دل نہ ٹھکتا ۔ بے چین رہتے کہ کہیں بگاڑ نہ دے ۔ اس لئے بیقرار ہو ہو کر کام کو خود جا کر دیکھتے ۔
اگر کام انکی مرضی کے موافق ہو جاتا تو معصوم بچوں کی طرح نہال نہال ہو جاتے ۔ دانشگاہ میں سالانہ چاء
پانی کا جلسہ تھا ۔ انتظام احمد علی صاحب کر رہے تھے ۔ اور ہر کام خانصاحب کی مرضی اور دل کے موافق
ہوا ۔ جیسی خوشی کے ساتھ انھوں نے احمد علی صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دی وہ بیان سے باہر ہے
لڑکوں پر ان کا ڈر بہت تھا ۔ کسی کا ہیاؤ نہ پڑتا کہ گھسے اور سامنے جائے ۔ اکثر اساتذہ کو بھی انکی ترشروئی
سے شکایت تھی انکی پہلی کڑک کو انگیز کر اگر سمجھ کو کام میں لا کر ان کو سمجھا دیا جاتا تو فوراً اپنی غلطی کا
اعتراف کر لیتے اور ہم نوا ہو جاتے ۔ لیکن انکی پہلی گرج کی اکثر کو برداشت نہ ہوتی اور جو کمزور دل کے
ہوتے بددل ہو کر شاکی ہو جاتے ۔ یہ نہ سمجھتے کہ خانصاحب شاہین کے انڈے سے نکلے تھے ۔ کہ جسکا
گھونسلا دشوار گزار پہاڑ کی چوٹی پر ہوتا ہے ۔ وہ اپنی محنت کے جوش میں اونچی چوٹی پر پہنچے تھے ۔ اور
پتہ رکھتے تھے ۔ چکر آنا ضروری تھا ۔ کوئی بھی میدان کا ساکن چوٹی پر پہنچ کر نیچے دیکھے گا ۔ سر چکرائیگا
اس وقت جو اسکے سامنے آئیگا ۔ امتلا کا شکار ہو کر ابتلا میں مبتلا ہوگا ۔ ایسے موقعوں پر دانشمندی
ہی کی ترشی اس وقتیہ مضرے کی کاٹ کر سکتی ہے ۔ اِدھر اس کا دل ہلکا ہو ۔ اُدھر اسکا چھٹکارا ۔
اب رہا چوٹیوں پر پیدا ہونے والوں کا وہ قرنوں سے اس بلند فضا کے عادی ہیں ۔ وہ کنجنجنگا ہی پر
چڑھ کر چکرائیں تو چکرائیں ۔ دوسرے خانصاحب تھے بڈھے کنوارے ۔ بڈھا کنورا ہوتا ہے کڑوا ۔

لیکن اس کو سمجھ کر برتاؤ کرو تو اس سے زیادہ کوئی میٹھا نہیں ۔ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دے سکتا ہے ۔ جو متاہل کیلئے ناممکن ہے ۔ اسکی جان ایمان تو بیوی بچے گھر بار ہوتا ہے ۔ اور مجرد کا محبوب مشغلہ اسکا کام اور وہ جو اسکو اور اسکے جذبات اور ذہنیت کو سمجھ گئے ہوں ۔ کنبہ خانصاحب کو لپٹا رہتا تھا اور اس بیسویں صدی میں وہ ابھی تک کنبہ پرور تھے ۔ بے گنتی نادار طالب علم انکی استعانت سے مستفید ہوتے ۔ وہ بے حساب مستحقین کی مدد کرتے اور کوئی حساب اسکا نہ رکھتے نہ کسی کو اسکا علم ہوتا وہ تو مالی مدد اپنی خوشی خاطر کرتے تھے کوئی نمائش تو منظور نہ تھی ۔ کہ دکھاوے کا دیا دیتے ۔ انکے زمانے میں دانشگاہ میں جامعہ کے امتحانوں کا نتیجہ بے مثل رہا ۔ اور اکثر طالبعلم اول درجے میں کامیاب ہوتے ۔ جو جلسے دانشگاہ میں ہوتے اسکا انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کرتے ۔ کہ دیکھنے والے انکے سلیقے کو دیکھ دنگ رہجاتے ۔ انھوں نے ایک لنکنار کی لنکنار دانش گاہ کی حصار دیوار کے ساتھ ساتھ کاڑی خانوں کی بنوادی ۔ ناہموار زمین کو کھدوا چھٹوا ہموار کر کھیل کے میدان نکالے اور ان کھیل کے میدانوں کے لئے بڑی خولصورت کوٹھک بنوانی شروع کی ۔ لیکن جو ہندوستانی حکومت کا نتیجہ انشاء اللہ ہمارے ہاتھوں ہوگا ۔ وہی حشر خانصاحب کی صدارت کا ہوا ۔ وہ ہمارے آپس کے پیار اخلاص محبت اتحاد کے شکار ہوئے ۔ سر سے پاؤں تک انکے اعصاب پرانے طنبورہ کے تاروں کی طرح ڈھیلے ہوگئے ۔ دو ایک برس بھی گھر بیٹھ کر وظیفہ کھانے کی نوبت نہ آئی ۔ اور لوگوں کی بدولت چھٹی لیکر بنیل گری گئے تاکہ تنگدلی کی گندگیوں سے دور رہ کر اپنی صحت درست کریں ۔ آخر دفعہ میں اُنسے نمائش ثقافت اسلامی مدراس میں ملا ۔ بہت شفقت سے پیش آئے ۔ ایک ایک کو نام بنام پوچھا ۔ میں نے کہا کہ اب تو آپ ماشاء اللہ روبصحت ہیں ۔ خوب تازگی آگئی ہے کہا شکر ہے ۔ لیکن رفتار میں وہ جوانی نہ تھی ۔ قدم گن گن کر رکھتے تھے ۔ دل ٹوٹ گیا تھا اور قلب کی شکایت ہوگئی تھی ۔ آخر اسی میں کنور جاکر جان جان آفریں کے سپرد کی اور دنیا کے مخمصوں سے چھوٹ گئے ۔ شفیق افسر اور باوفا ملازم تھے ۔ ملک اور مالک کے ہمیشہ ہی خواہ ۔ اب حاسدوں کی دسترس سے دور ہیں اور ہم سے اچھی جگہ ہیں ۔ خداوند کریم انکی روح کو سکون اور اپنا قرب بخشے اور انکے مظلوم سے ہم کو نجات ۔ آمین ۔

آغا حیدر حسن مرزا

مرحوم کی خدمات

مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۲۳ء میں ٹیکسپیرہٹ (انگلستان) میں ہوئی۔ یہاں پر تعرف اور رسمی بات چیت کے علاوہ صرف اتنا معلوم ہوا کہ " لوکل سلف گورنمنٹ" پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ مرحوم سے انگلستان میں دو ہی چار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ بلدہ آنے کے بعد میرا اور مرحوم کا اٹھارہ سال ایک جگہ ساتھ رہا۔ تبادلۂ خیال کا بہت موقع ملا۔ اور ہمیشہ مرحوم کے خیالات کی بلندی اور پاکیزگی نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ مرحوم کو تاریخ اسلام میں بھی کافی معلومات تھے' میری کتاب " فاطمیئں مصر" کے کئی مقامات دیکھے۔ اُردو پڑھ کر خوبی سے سمجھ جاتے تھے' طبیعت کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف تھا۔ امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کے اُردو ترجمہ کا اکثر مطالعہ کیا کرتے تھے۔

وہ اس درسگاہ سے تیس سال سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہے۔ پرنسپل اسٹرج کے زمانہ میں وہ لکچرر کی حیثیت سے اس کالج میں داخل ہوئے۔ انھوں نے تاریخ اور معاشیات مضامینِ اختیاری لیکر نظام کالج ہی سے امتحان ام۔ اے میں شرکت کی اور امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ انھیں اس کامیابی پر جامعہ مدراس کی طرف سے نارٹن انعام دیا گیا جو امتحان ام۔ اے میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ بہ حیثیت لکچرر وہ بہت مقبول ہوئے اپنے شاگردوں اور ہم چشموں میں بہت وقعت اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں وہ اعلٰی تعلیم کیلئے عازم انگلستان ہوئے۔ اور وہاں ۹ برس تک مقیم رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے " مقامی خود اختیاری حکومت" پر تحقیقات کئے۔ اور قانون کی سند بھی حاصل کی واپسی پر چند دنوں کے لئے محکمۂ فینانس نے اُن کی خدمات حاصل کیں لیکن پھر وہ بحیثیت پروفیسر

تاریخ و معاشیات اور معینِ صدر اِس درسگاہ سے آملے۔ اِس خدمت کے علاوہ کچھ عرصہ تک وہ ناظم معلومات عامہ بھی رہے۔ اس کے بعد انھیں آئینگار کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بہت مشقت طلب کام سرانجام کرنے پڑے اور مرحوم نے رضاکارانہ جوش کے ساتھ حکومت کی خدمت کی پرنسپل ٹرنر کے جاگیردار کالج پر تبادلہ کے بعد سب سے زیادہ سینیر ہونے کی وجہ ۱۹۳۹ء وہ صدر کلیہ ہو گئے۔ جہاں انھوں نے رُبع صدی بیشتر ایک لکچرر کی حیثیت سے ابتدا کی تھی۔ قادر حسین خانصاحب فرنگی صدور کی ایک لمبی کڑی کے بعد پہلے ہندوستانی صدر ہوئے۔ اور انھوں نے اس حیثیت سے غیر معمولی صلاحیتوں کی داد دی۔ مرحوم کے دورِ صدارت میں جو نمایاں تعلیمی اور تربیتی ترقی ہوئی، وہ تاریخ نظام کالج میں عدیم المثال رہے گی۔ خصوصاً اس سال (۱۹۴۳ء) تمام امتحانات کے نتائج نے ہمارے کالج کو شہ نشینِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور اس ساری کامرانی کا باعث قادر حسین خاں مرحوم تھے

قادر حسین صاحب کی زندگی نجی اور بیرونی گرفت سے بالاتر ہے۔ مرحوم ایک مخصوص عالمانہ شان کے مالک تھے، ضمیر پرست اور متدین ہونے کے علاوہ وہ ایک محتاط رحم دل، کریم النفس اور پرخلوص آدمی تھے۔ وہ ایک زبردست مودب بھی تھے۔ طلباء اُن کے فدائی تھے اور اُنھوں نے اپنے آپ کو بالکلیہ طلباء کے مفاد کیلئے وقف کر دیا تھا۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جسکی باعث مرحوم ایسی غیر معمولی ہردلعزیزی کے مالک تھے۔ حیدرآباد کے اہل الرائے اور روشن خیال طبقہ کا ایک بہت بڑا حصہ خانصاحب کی شاگردی کا دم بھرتا ہے۔ اور تقریباً تمام بڑے عہدوں پر انھیں کے شاگرد فائز نظر آتے ہیں مرحوم اس طبقۂ خاص میں ایک خاص وقار کے مالک تھے۔ اپنے تمام ساتھیوں سے مرحوم کا برتاؤ ہمیشہ محبانہ رہا۔ مرحوم نے ہر جائز امداد سے کبھی دریغ نہ کیا اور اُن کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرتے رہے۔ مرحوم کی ہمیشہ آرزو رہی کہ تمام اساتذہ آپس میں ایک دوسرے سے ملے جلے رہیں اور اُن میں نشاط قائم ہو۔ چنانچہ مرحوم کی انتہائی کوشش سے اساتذہ کلب کا قیام اسی مقصد کی خاطر عمل میں لایا گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا مرحوم نے اساتذہ اور اہلِ دفتر کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانے کی خاطر کلیہ کی عمارت میں توسیع کی۔ یہ ایک ایسی ضرورت تھی جو مدت سے محسوس تو کیجا رہی تھی لیکن اس کو رفع کرنے کی کوئی سعی بلیغ ابتک نہیں کی گئی تھی۔ ان سب کے علاوہ مرحوم کو اسی ادارے سے غایت درجہ محبت تھی۔

انھوں نے اِس درسگاہ کو وسیع بنانے اور اس میں روحِ عمل پیدا کرنے کیلئے اپنی پوری قوتوں کو صرف کردیا اور اس کی اصلاح و فلاح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مرحوم ہی کے مبارک ہاتھوں نے پیویلین کی بنیاد ڈالی اور مرحوم ہی کی کاوشوں کی بدولت ہاکی اور فٹ بال کے میدانوں کو بڑے پیمانہ پر آراستہ کیا گیا۔

ان تمام کارہائے دشوار کی انجام دہی کی خاطر مرحوم کو اپنا بہت کچھ وقت اس ادارے کے نذر کرنا پڑتا تھا۔ اور مرحوم بلا عذر و شکایت اپنا تمام تر وقت اسی کے حوالے کر دیتے تھے عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ہمیشہ وہ دس سے چھ تک کالج کے دفتر ہی میں نظر آتے حتیٰ کہ تعطیلات میں بھی وہ شام میں دیر گئے تک مصروفِ کار نظر آتے۔ مرحوم ایک غیر معمولی احساسِ ذمہ داری اپنے میں رکھتے تھے جو بہت کم میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی چھٹی نہیں لی اور اس رات دن کی محنت نے مرحوم کی صحت پر لازمًا بہت بڑا اثر کیا اور اسی کے ہاتھوں نذرِ اجل ہوئے۔

ڈاکٹر زاہد علی
معین صدر نظام کالج

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے؟ خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

اِترا نہ بہت ہستئ موہوم پہ غافل
کچھ اس کی حقیقت نہیں چشمِ حکما میں
ترکیبِ عناصر میں خلل آگیا جس دن
جز خاک ہی کچھ آگ نہ پانی نہ ہوا میں

صدق جائسی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

لائق اور خاموش علمی کارکن

ادارۂ ادبیات اردو
خیریت آباد حیدرآباد دکن
مورخہ ۲۶ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

جناب من —

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ نظام کالج کے طلبہ اپنے ہر دلعزیز پرنسپل قادر حسین خاں مرحوم کی یاد کے لئے اپنے رسالہ نظام ادب کا ایک شمارہ وقف کر رہے ہیں۔

مرحوم قادر حسین خاں سے میری پہلی ملاقات برٹش میوزیم لندن کے ایوان مطالعہ میں ہوئی تھی۔ میں قدیم اردو کتابوں کی تلاش میں وہاں جایا کرتا تھا اور ان سے جب میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ .... کے لئے کچھ کام کر رہے ہیں اور اسی کے سلسلہ میں کتابوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ میری روانگی یورپ سے بہت عرصہ قبل وہ وہاں پہنچ چکے تھے اور مدت سے وہیں مقیم تھے۔ ان کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت سخت مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں۔

حیدرآباد واپس ہونے کے بعد ناظم معلومات عامہ اور پھر پرنسپل نظام کالج کی حیثیت میں ان کو دیکھا اور ان سے کئی بار ملا اور اگرچہ یہاں ان سے بہت زیادہ قریب ہونے کا موقع نہ مل سکا لیکن جب کبھی ملاقات ہوتی وہ اسی خلوص اور شفقت سے پیش آتے جو پہلی بار انھوں نے لندن میں ظاہر کی تھی۔

وہ ایک خاص طبیعت اور اصول کے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام کالج جیسے ادارے کے پرنسپل رہ کر یہ محسوس کرا دیا کہ ایک ہندوستانی بھی کسی ادارے کو اسی خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلا سکتا ہے جس طرح انگریز چلاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ان کی بے وقت وفات نے ہم کو ایک ایسے لائق اور خاموش علمی کارکن سے محروم کر دیا جن کی ذات سے آئندہ بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ انھیں ابھی ابھی سنبھلنے اور اپنی صلاحیتوں کے دکھانے کا موقع ملا تھا اور ہم لوگوں نے ابھی جیسی چاہئے ویسی انکی قدر نہ کی تھی کہ وہ ہم میں سے اٹھ گئے۔ لیکن انکی یاد باقی ہے اور نظام کالج کی تاریخ میں زندہ رہے گی۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

پروفیسر قادر حسین خاں یورپ میں

اس قحط الرجال زمانہ میں کسی موقر و ممتاز ہستی کا قبل از وقت گزر جانا ایک قومی سانحہ ہے جس کی تلافی بہر حال ممکن نہیں۔ پروفیسر قادر حسین اپنی ہمہ گیر قابلیت کی بنا پر علمی اور تدریسی حلقوں میں ایک وقیع پایہ کے مالک تھے۔ علمی وسعت و جامعیت کے ماسوا تجارب و مشاہد، قوت نسق، مذہبی گہرائی، اخلاقی جمعیت ان کے وہ ملکات اور اوصاف فاضلہ تھے کہ جن کی بنا پر وہ ہر کہ و مہ میں مقبول رہے۔

یورپ کی مادی اور خیالی زندگی ان کو گمراہ نہ کر سکی۔ چنانچہ ایک طویل عرصہ کے قیام کے باوجود مذہب اور مشرقی ثقافت سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ علمی حیثیت سے وہ اپنے طلباء کے لئے ایک پیغام تھے۔ مافوق الطبعی گہرائی، مذہب سے وابستگی، مشرقی تہذیب پر ایقان وہ عوامل ہیں جو ان کی خاموش زندگی کو پرشکوہ اور نوجوانانِ شرق، بالخصوص مغربی تعلیم یافتوں کے لئے، دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔

یورپ کے قیام کے دور میں بھی وہ ہر آن مذہب اور مذہبی طریق زندگی سے مربوط اور وابستہ رہے حالانکہ لعبتانِ فرنگ کی عشوہ سامانیاں، مئے ناب کی جھلک پاشیاں اور قدم قدم پر عیش و طرب کی برق پاشیاں ایک انسان کو صراط مستقیم سے ہٹا سکتی ہیں لیکن وہ انسان قابل احترام ہے جو ان کی سطحیت اور بے مائگی کو لئے ہوئے اس احساس کو تازہ رکھے کہ خدا ہی سب کچھ ہے۔

علم سے مرحوم کو ایک شوق والہانہ تھا۔ ایسے زمانہ میں جب کہ علم کی نوعیت کاروباری سکہ سے بڑھکر نہ ہو ایک شخص کا علمی افکار اور حقائق کی تلاش میں فنا ہو جانا ایک وقت دو حقیقتوں کو پردہ در کرتا ہے۔ علم بہ حیثیت مجموعی قومی زندگی اور مظاہر تمدن کے لئے حیات و بقاء کا باعث اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ارتیاب، تحقیق و استنباط کی شان نہ پیدا ہو۔ قادر حسین اس مسلک کے واسطہ سے فلسفہ تمدن کی حقیقت کو علمی حیثیت سے ثابت کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف انھوں نے قوموں کے عروج اور ملت اسلامیہ کے عزۂ ماضی کی

کما حقہ ترجمانی کی ہے۔

ان کی زندگی کی سادگی، عیش و نعم سے کنارہ کشی، قاطبتاً داعیات جنسی سے احتراز وہ پہلو ہیں جو ایثار و فدویت کی زندہ جاوید تصاویر کہی جاسکتی ہیں ان کا مدعا کیا تھا؟ یہی کہ "العشق نار یحترق بماسوا المحبوب" لیلئے علم کا دیوانہ با ہوش نہیں ہوسکتا۔ جب علم کے عشق نے سب کچھ جلادیا تو سوائے لیلئے علم کے دوسری چیزوں کا باقی نہ رہنا ایک اضطراری نتیجہ ہے ؎

غلام نرگس مست تو تاجدارانند | خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

حصول تعلیم کے بعد جب انھیں نظام کالج کی پروفیسری مل گئی تھی تو انھیں قانع ہوجانا چاہئے تھا لیکن جس کے دل میں "ذروۂ سینائے علم" کی یاد اور محویت تڑپا رہی ہو وہ پروفیسری کی ظاہری وجاہت، ناز و نعم سے مملو زندگی پر کب اعتبار کرسکتا ہے۔ یہ تھے وہ داعیات اور سوز و ساز کے پہلو جو یورپ جانے کے محرک ہوئے۔ علمی تڑپ کے ماسوا ان کی زندگی کا لاہوتی رنگ خود حصول علم کے لئے رخت سفر باندھنے کے داعیہ کو ایک اور رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اسلام میں علم کی طلب کو فریضہ قرار دیتے ہوئے نبی عربی صلعم نے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے ارشاد سے علم کے حصول کے لئے دشت پیمائی اور ہر آن گام زنی پر زور دیا ہے۔

مغربی تعلیم کے باوجود جس کا قلب "قلب مومن" کی دولت جاویدانی سے فیض کام ہو وہ ہر قدم پر داعیات مذہب کا لحاظ ضروری سمجھتا ہے علم کا مقصد اولین کیا ہے؟ یہی کہ علمی وجدان اور علمی انہماک مذہبی وجدان اور مذہبی انہماک کو پیدا کرے۔ یاد تو منائی جاسکتی ہے، عقیدت کے اظہار میں جلسے کئے جاسکتے ہیں۔ آتش پاش مقالے لکھے جاسکتے ہیں لیکن یہ سب اپنے عمل میں لعینی بھی ہوسکتے ہیں اور لایعنی بھی۔ ان سب کا مقصد غائی یہ ہو کہ ہم میں بھی نزاہت اعمال، فکر و نظر میں تڑپ، زندگی میں حرکت، علم کے حصول میں گداخت و سوختگی، مذہبی مافوق الطبعی گہرائی اور حکیمیاتی ارتیاب کی تسترن زاری کرسکیں تو پھر ان کو با معنا اور با اقدار سے مملو کہا جاسکتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں پروفیسر موصوف انگلستان گئے۔ اپنی تڑپ اور تشنگی کی آبیاری کے لئے نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے نظم و نسق عامہ PUBLIC ADMINISTRATOR سے طبعی لگاؤ تھا اس لئے ایک عرصہ تک اس موضوع پر تحقیق کرتے رہے۔ ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں اور اس

شوقِ خاص کے عملی تجربہ کا ذوق انھیں فرانس، المانیہ اور سوئستان کشاں کشاں لے گیا یہاں آئمۂ فن کی صحبتوں، ان کے والہانہ علمی تبحر، اور ان تھک تحقیقاتی جمعیت و جامعیت، دل فروز مکالموں، ضیا گستر تقریروں سے استفادہ کیا فکر و نظر کی تشفی کے ساتھ ساتھ متعلقہ حکومتوں کے حکام سے تبادلۂ خیالات اور دفاتر اور اداروں غرض یہ کہ نظم و نسق کی مشنری کے سارے اجزاء کا غائر مطالعہ کیا۔ یہ ساری کاوش اور زہرہ گداز وقت نظری کی علت یہ تھی کہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کے باہمی تعلقات کی تحقیق اور عمل اور ردعمل کا پتہ چلایا جائے۔

موقع بہ موقع اپنے تحقیقاتی داعیات کے تکملہ کے لئے وہ متذکرہ ممالک کو جاتے رہے لیکن زیادہ تر وقت لندن اور فرانس کی ساربان یونیورسٹیوں میں ختم ہوا۔ اس طویل عرصہ میں کئی مرتبہ علیل بھی ہوئے۔ ناسازگاری آب و ہوا کی بناء پر معالجین نے وطن جانے کا مشورہ بھی دیا لیکن وہ شخص جو علم ہی کو جینا اور مرنا تصور کرے بھلا وہ بغیر حصول مقصد کے اپنے کاشانۂ دل میں وطن کا خیال بھی لاسکتا ہے جو علمی سوز و ساز اور تڑپ یورپ کے علمی ماحول میں ہے وہ تیرہ بخت وطن میں کہاں ؎

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت — اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

شہید سوز و ساز علم کے لئے جگر کاوی کا سودا اسی ماحول کے "کلیم ذروۂ سینائے علم" کی صحبت میں حاصل ہو سکتا ہے سڈنی وب SYDNEY WEBB پروفیسر گراہم والس PROF. GRAHAM WALLIS پروفیسر ارنسٹ بارکر ERNEST BARKER پروفیسر ڈبلو جی ایس آڈمس PROF. W.G.S. ADAMS پروفیسر گیاسٹن جیز GASTON JEZE جوزف بارتھیلمی JOSEPH BARTHELEMY اور لارڈ پسفیلڈ LORD PASSFIELD وہ علماء نے فاقد النظیر ہیں کہ جنھوں نے قادر حسین کی علمی آبیاری کی۔ ہندوستان کا علمی طبقہ ان آئمۂ فن سے ناواقف نہیں اور خود ان چند در چند ناموں سے قادر حسین کے علمی موقف اور وجدان صحیح کا پتہ چل سکتا ہے۔ استاد وہ ہی ہے کہ جو شاگرد کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اگر متذکرہ عظام رجال کا کوئی پایہ ہمارے قلوب میں ہے تو وہ خود قادر حسین کے علمی پایہ کا اندازہ لگانے میں دلیل راہ ہوگا۔

پبلک اڈمنسٹریشن کے سلسلہ میں جب وہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کے تعلقات پر کافی ریسرچ کر چکے تو ازاں بعد برطانوی ہند کے مقامی و مرکزی حکومتوں کی تنظیم و تعلقات پر انڈیا آفس اور برٹش میوزیم

کتب خانوں میں مصروف تحقیقات رہے تحقیقات کی شق اول کا مقصد یہ تھا کہ عل متقابلہ سے ہندوستان کے لئے ایک بہترین دستور کا خاکہ تیار کیا جائے جو اپنی اساس میں بین الاقوامی پس منظر کے ساتھ ہندوستان کے خاص ماحول اور داعیات اور عوامل کے حسب حال ہوسکے۔

پروفیسر قادر حسین کی سیاست اور ملکی نظم ونسق سے خاص دلچسپی اور تبحر کا پتہ اس چیز سے بھی واضح ہے کہ خود انگلستان میں ادارہ نظم ونسق عامہ INSTITUTE OF PUBLIC ADMINISTRATION کی تاسیس میں ان کی اس خاص شق میں قابلیت اور جامعیت کو تسلیم کرتے ہوئے بانیان ادارہ نے ان کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سیاسیات و نظم ونسق براہ راست علوم عمرانی سے متعلق ہیں اور ان کی کما حقہ ترجمانی اور احاطہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قانون کے ارتباط سے ان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ قادر حسین کی دوررس نگاہ نے اس حقیقت کو تاڑ لیا تھا۔ ابتدائی دور میں بلاشبہ وہ مجرد حیثیت سے نظم ونسق کی تحقیق کی حد تک محدود رہے لیکن اس میں ثبوتیت اور کمال و واقعہ بینی کے مدنظر آخری دور میں قانون کی طرف توجہ معطوف کی چنانچہ مڈل ٹمپل کے قدیم اور شہرۂ آفاق قانونی ادارہ سے بیارسٹری کی سند حاصل کی۔ قانون میں وقت رسی اور تبحر و ژرف نگاہی پیدا کرنے کی خاطر چیمبر ریڈنگ کے سلسلہ میں ایک سال تک مسٹر گلبرٹ اسٹون GILBERT STONE کی ماتحتی میں قانونی ٹریننگ حاصل کی مسٹر گلبرٹ اسٹون ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور و معروف ہیں وہ اپنی ممتاز قانونی صلاحیت اور علمی ملکات کی بناء پر نہ صرف سر کے خطاب سے مفتخر ہوئے بلکہ ناگپور کے میر مجلس بھی ہوئے۔

قادر حسین کے علمی شوق نے ان کی نظر میں وقت اور خاص علمی مردم شناسی کا مادہ پیدا کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے علمی دور میں عدیم النظیر اساتذہ اور آئمہ فن کی صحبت اور ان کی لاتحصٰی علمی معیت سے فائدہ اٹھایا۔ مڈل ٹمپل میں بھی ان کے اساتذہ وہی مسلم الثبوت آئمہ قانون ہیں جو اپنی ہمہ گیری کی بنا پر بین الاقوامی شہرت کے ماسوا ہنتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ مسٹر گلبرٹ اسٹون بہ حیثیت رکن عدالت جو درجہ رکھتے ہیں اس کا اندازہ ہمارے حیطہ استعداد سے بعید ہے لیکن قانونیات میں ان کا جو پایہ ہے اس کا ثبوت خود اس سے ملتا ہے کہ وہ چیمبر ریڈنگ کے ایک رکن رکین رہے۔ چیمبر ریڈنگ میں تعلیم اور فارغ التحصیل طلبائے قانون کی تربیت کی زمام انھیں معلمین کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو بہمہ وجوہ فاقد النظیر کہے جاسکتے ہیں۔

قادر حسین کی علمی ہمہ گیریت کے متعلق اظہار رائے ایک ہیچ میدان کیا کر سکتا ہے جب کہ رائٹ آنریبل ایچ اے ایل فشر (RT HON'BLE H.A.L. FESHER) سابق وزیر تعلیمات انگلستان رطب اللسان ہیں انھیں مرحوم کی علمی قابلیت، تعلیمی جستجو اور علم کی خاطر استمراری تڑپ کا اعتراف تھا۔

۱۹۲۹ء میں وہ حیدرآباد واپس آئے۔ ابتداً مختلف سرکاری خدمات انجام دیں لیکن سر اکبر مرحوم جیسے عدیم المثال مدبر کو آپ کی خاص سیاسی اور دستوری قابلیت کا پتہ چلا تو انھوں نے معلومات عامہ کے اہم ادارہ کی نظامت تفویض کی۔ برطانوی ہند کے ایکٹ ۱۹۳۵ء کی متابعت میں جب ہندوستان میں دستوری تبدیلیاں ہوئیں تو حیدرآباد بھی اس کی زد سے متاثر ہوا۔ اسی سانحہ کا ایک جز دستوری اصلاحات کا اعلان اور تقدیماً آئنگار کمیٹی کا انعقاد ہے۔ فرمان خسروی کی بناء پر پروفیسر قادر حسین کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے بحث و مباحث اور دستوری تجاویز میں مرحوم نے جو حصہ لیا ہے اس نے ایک طرف ارکان کو ان کی بے نظیر دستوری قابلیت کا معترف بنا دیا تو دوسری طرف حیدرآباد کی دستوری تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔

موصوف کی سرکاری خدمت اور قومی و تعلیمی مساعی حیطہ موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں فقط

المرقوم یکم آذر ۱۳۵۳ف
بمقام ملے پلی حیدرآباد

ڈاکٹر محمد بشارت علی کان اللہ لہٗ
بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن)
لکچرار گورنمنٹ چادر گھاٹ کالج

بنگلور شہر

قائد الملک
صدر مجلس اسلامیہ

مشفقی قاضی احمد بشیر الدین صاحب

معتمد "نظام ادب" نظام کالج حیدرآباد دکن

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا غم نامہ مورخہ ۷ ماہ تمبر پہنچی ملگیا۔ راقم الحروف تقریباً اسّی سالہ بوڑھا ہے عوارض ضعیفی کا ہمیشہ شکار رہتا ہے۔ جواب جو دیر سے ارسال خدمت ہے اس کی وجہ ظاہر ہے معاف فرمائیے۔

نظام کالج کے مشہور آفاق لائق و فائق پرنسپال محب عزیزم پروفیسر قادر حسین خاں صاحب ایم اے مرحوم سے مجھے تیس سال کی شناسائی اور محبت تھی۔ کرسچین کالج مدراس کے وہ ایم۔اے اور جنوبی ہند میں صوبہ مدراس کے لائق ترین اور دردمند دل رکھنے والے مسلمان تھے۔ اسلام کے فدائی اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ امت محمدی کی ہمدردی ان کے دل میں عمر بھر جاگزیں رہی۔ وہ اپنے قبیلہ خاندان اور اقربا کے ہمیشہ مصلح اور سرپرست رہے۔ اپنے رشتہ داروں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی پر اپنے مال وجاہ ورسوخ کو بے دریغ خرچ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ الغرض اس زمانہ میں ایک تعلیم یافتہ سچے مسلمان کا عمدہ ترین نمونہ تھے۔ ان کے آباو اجداد سرحدی پٹھانوں کے ایک معزز خاندان کے افراد تھے۔ صوبہ ارکاٹ کی تاریخ میں ان کے آباو اجداد کے خاص طور پر تذکرے ہوئے ہیں۔ یہ خاندان زمانہ سلطنت والاجاہی کے بعد ضلع جنوبی ارکاٹ میں بسا ہوا تھا۔ ان کی چھوٹی بڑی زمینداریاں تھیں شرفائے ضلع میں گنے جاتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی اسد اللہ خاں بی ای ال اگر حیدرآباد سروس میں داخل ہوکر ترک وطن نہ کردیتے اور مدراس میں وکالت کرتے رہتے تو مقامی ہائیکورٹ کی ججی کا مل جانا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوتی اور خود قادر حسین خاں مرحوم کا درجہ مدراس گورنمنٹ میں کسی سے کم نہ ہوتا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نظام ادب اور دوسری انجمنیں اور ان کے ارکان، اور پروفیسر صاحب مرحوم کے شاگرد اور اقربا سب کے سب تعزیت کے حق دار اور قابل ہمدردی ہیں۔

احقر العباد

غلام احمد کلامی

قادر حسین خاں صاحب کی شخصیت

یہ سارا شعور عالم عبث نہیں پیدا کیا گیا اور یہ ساری کائنات یقیناً ایک یزدانی مقصد کی جانب غیر مرئی طور پر کھنچی چلی جارہی ہے اور انسانی موت وحیات کا سارا گورکھ دھندا اس لئے ہے کہ ہر متنفس کی قیمت کا اندازہ اس کے عمل سے لگایا جائے بفحوائے آیہ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا......

پیدائش کے ساتھ ہی موت کا تصور بھی اس کے جزو لاینفک کی طرح پیش ہوجاتا ہے گویا حیات و ممات کی تخلیق توأم ہے اور حیات میں اگر کوئی چیز بالکل یقینی ہے تو وہ صرف موت ہے اور غالباً اسی وجہ سے موت کے لئے دوسرا لفظ اصطلاح قرآنی میں یقین ہے فَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ....

ہر پیدا ہونے والی جان کے لئے اس کالبد خاکی کو آخر الوداع کہنا لابدی ہے ؎

ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید   زجام دہر مئے کل من علیہا فان

گر مبارک ہیں وہ ہستیاں جنہوں نے اس حیات مستعار کو بیکار رلایا اور زندگی کے اس بڑے امتحان میں کامیاب نکلے۔ ایسے[1] لوگوں کے لئے موت ایک دائمی زندگی کا پیام اور ان کے حق میں قدرت کا بہترین انداز ہے۔ یہ لوگ اپنے جسم عنصری کی فنا کے بعد آنکھوں سے تو بلاشبہ اوجھل ہوجاتے ہیں مگر دلوں کی لازوال دنیا میں وہ ضرور بستے ہیں اور انکی یاد ارباب ذوق کے پاس ہمیشہ ہمیشہ تازہ اور زندہ رہتی ہے ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اسی نوع کی ایک غیر معمولی ہستی ہمارے معزز و محترم دوست اور بہی خواہ قوم وملت جناب

---

[1] آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصفجاہی صدر المہام بہادر تعمیرات کا پیام تعزیتی دیکھئے۔

پرنسپل قادر حسین خانصاحب کی تھی جنھوں نے کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے (۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء) کہ حیات فانی کو خیرباد کہا اور عالم جاودانی کی راہ لی۔ پرنسپل صاحب مرحوم کا سلسلۂ ملازمت گو نظام کالج حیدرآباد دکن سے منسلک تھا اور یقیناً انھوں نے اس کالج کے لئے جو کچھ کیا وہ بدیہیات ہے اور عیاں راچہ بیاں، مگر قدرت نے ان کی نظر کو وسعت اور طبیعت کو کچھ ایسی ہمہ گیری عطا فرمائی تھی کہ وہ بیرون ممالک محروسہ بھی ہر قومی، مذہبی تعلیمی اور تعمیری ادارے سے دلی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی مقدور بھر اس کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں اور ساعی رہتے تھے۔ اس طرح جناب خاں صاحب مرحوم کی موت نہ صرف نظام کالج کے لئے بلکہ اور بہت سے قومی اداروں کے لئے ایک ایسے نقصان کی مترادف ہے جس کی تلافی اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم بھی طلباء اور ارباب نظام کالج کے ساتھ ان کے اس دلی درد و رنج میں برابر کے شریک ہیں۔

منجملہ اور اداروں کے جو جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے لئے کوشاں ہیں اور جن سے پرنسپل صاحب مرحوم کو گہری محبت اور خاص دلچسپی تھی، ایک ہمارا اسلامیہ کالج وانمباڑی بھی ہے۔ میری رائے میں پرنسپل صاحب کے اس خاص تعلق کے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ کچھ ربع صدی پیشتر اس کی داغ بیل انھیں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ تھی اور دوسرے یہ کہ ایک حیدرآبادی اور خصوصاً خود نظام کالج ہی کا ایک قدیم طالبعلم اس کا پرنسپل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب چند ماہ پیشتر میں نے مرحوم سے اس کالج کے فرسٹ گریڈ بنائے جانے کے سلسلہ میں یہاں کے ارباب حل و عقد کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا تھا تو اس حلم دوست، مسلمانوں کے سچّے حامی اور مجسمۂ اخلاص انسان کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اس کیفیت کو میں اپنی مدت العمر نہ بھلا سکوں گا گویا خاں صاحب مرحوم نے یکایک کوئی بڑا ہی انمول خزانہ پالیا ہو۔ ان کی حقیقی خوشی قومی فلاح و بہبود میں مستتر تھی۔ آج رنج و اندوہ ہے تو اسی امر کا ہے کہ وہ قوم کی خوشی کو اپنی خوشی اور اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے والا اور خاموش کام کرنے والا چارہ کار اور غمگسار نہ رہا۔ خاں صاحب مرحوم میں قدرت نے جو مذہبی اور قومی جذبات ودیعت کئے تھے وہ ان کی جبلّی انکساری اور خاموشی کی وجہ سے عوام پر سو میں ایک حصّہ بھی ظاہر نہ ہونے پائے اور نہ ہی ان کو ان کے اظہار کی آرزو تھی۔ مگر جو لوگ پرنسپل صاحب مرحوم کو جانتے تھے وہ یقیناً ان کے اس درد نہاں سے واقف تھے۔ طلباء کے ساتھ وہ پدرانہ شفقت جس کا صحیح انداز

کچھ طلباء ہی خود لگا سکتے ہیں اور پھر اپنے پرائے کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ اور اپنی ساری زندگی کو اپنے کام کے لئے وقف کر دینا انھیں کی خصوصیات تھیں ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آخر میں بارگاہ صمدی میں میری یہ دلی دعا ہے کہ وہ اپنے افضال و اکرام سے اس معزز و مکرم انسان کو اپنی رضا سے نہال کرے اور ہماری قوم میں جسے ابھی بہت سے منازلِ ترقی طے کرنے ہیں خاں صاحب مرحوم کے امثال و اقران زیادہ کرے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

سیّد عبدالوہاب بخاری
صدر کلیۂ اسلامیہ وانمباڑی

رواں ہے عمر اور انسان غافل (جلیل) مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے

تیری تیزی کے مقابل اے عمر (غالب) برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے (غالب) نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر (آتش) مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

درسِ عمل

حیدرآباد دکن

مورخہ ۲۹ - خورداد ۱۳۵۳ ف / ۳ - مئی - ۱۹۴۴ع

بخدمت شریف جناب معتمد صاحب نظامِ ادب نظام کالج

میں جس رتبہ کو پہنچا ہوں اُس تک پہنچانے میں پروفیسر قادر حسین خاں مرحوم مغفور کا اتنا بڑا حصّہ ہے کہ میں اُس کو کبھی بھی نہیں بھلا سکتا۔

مرحوم سے مجھ کو کم و بیش دس سال شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جب مرحوم قادر حسین خاں زمرۂ ملازمت میں شریک ہوئے تو اُس وقت میں فرسٹ فارم میں تھا۔ اُس وقت مرحوم ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جب بی۔اے کی ڈگری لے کر میں نے کالج چھوڑا ہے تو غالباً مرحوم اُس وقت انگلستان میں تشریف رکھتے تھے لیکن اُس سے کچھ ہی پہلے تک وہ کالج میں بھی ہم کو مختلف مضامین کا درس دیتے رہے۔ اور سب سے اہم درس جو انھوں نے دیا وہ یہ تھا کہ ہمیں دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صرف اپنی محنت اور خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی میرے تعلقات مرحوم سے برابر قائم رہے۔ چنانچہ جب کبھی مجھے اہم معاملات میں مشورہ کی ضرورت ہوئی میں نے ہمیشہ اپنے شفیق استاد کا رخ کیا اور ہر مرتبہ نہ صرف دنیوی حیثیت سے قیمتی مشورہ حاصل کر کے لوٹا بلکہ روحانیات۔ قناعت اور

خدا پر کامل بھروسہ کا بھی ایک ناقابل فراموش سبق لیتا آیا۔ اب بھی جب کبھی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے استاد مرحوم کا پر سکون اور باوقار چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ پرخلوص قلب سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے ہیں کہ محنت کرو۔ خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دو اور خدا پر بھروسہ کرو۔ اور معاً ایک سکون قلب اور استغناء محسوس ہوتا ہے اور غالباً یہی وہ سب سے زیادہ قیمتی درس ہے جو مرحوم اپنے ایک ادنیٰ خادم اور شاگرد کو دے گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

محمد کرم اللہ

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی　　ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو　　کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر　　بتا روتی ہے کس کی ہستیٔ موہوم پر شبنم
گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر　　شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

چند دلچسپ پہلو

"قادر حسین خاں سے میری پہلی ملاقات "قرآنک ورلڈ" کے سلسلے میں ہوئی، میں آفس میں ملا، رسالہ کے اجراء کی غرض بیان کی، بخندہ پیشانی وعدہ کیا کہ وہ میرے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اس کی مدد کریں گے۔

"قرآن مجید نوعِ انسانی کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے" اور مسلمان جو اپنے کو "اہلِ قرآن" کہتے ہیں وہ اس فرض کو فراموش کئے ہوئے ہیں کہ روئے زمین کے ہر فردِ انسان کے کانوں تک اس آواز کا نہ پہنچانا ان کا ناقابلِ معافی قصور ہے، اور "قرآنی حکومت" کا قلادہ اگر گردنوں میں نہ ڈالا گیا تو "انسانیت" کبھی فلاح نہ پائے گی۔ اور چونکہ دنیا کے بڑے حصہ پر انگریزی زبان بولی اور سمجھی جاسکتی ہے، اس لئے اس صدا کو "قرآنک ورلڈ" کے ذریعے پہنچانا مقصود تھا۔

زیادہ تر مضامین کا جمع کرنا میرے ذمہ تھا اس کے بعد کے سارے مرحلے قادر حسین خاں کی توجہ سے طے پاتے تھے، مضامین کا انتخاب، اور ترمیم و اضافہ سب کچھ انجام دے چکتے تو پروف دیکھنے کی باری آتی، اس کام کو بھی پورا کرتے، اور رسالہ چھپ کر تیار ہوتا پھر اس کی اشاعت بیرونِ ہند تک عمل میں آتی۔

"قرآنک ورلڈ" سہ ماہی رسالہ تھا اور تقریباً تین سال تک قادر حسین خاں نے اس کی علمی اور مذہبی خدمت انجام دی مگر دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ پورے فائل میں، ایک نمبر کے ایک صفحہ کی ایک سطر میں بھی کہیں ان کا نام نہیں آیا ہے۔ اس اعزازی اور بے نام و نمود کے عمل کی اللہ تعالےٰ سے التجا ہے کہ ان کو اچھی جزا دے اور قرآن کو ان کا شفیع فرمائے۔

اب قادر حسین خاں سے میرا ایک دوستانہ قائم ہوچکا تھا اور سات آٹھ سال کی مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا یہاںتک کہ وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے ۔

اسی سات، آٹھ سال کی مدت میں جہاںتک میں ان کو سمجھ سکا وہ یہ کہنے کے لئے کافی ہے کہ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں ۔

"منی آرڈر بک" قادر حسین خاں کے میز کی ایک مستقل چیز تھی، وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کا ایک مقررہ حصہ حاجتمندوں کو وقت پر بھیجا کرتے تھے اور اس کی پابندی ایسی تھی جیسے کوئی عبادت گذار اپنے وظیفہ کا خیال رکھتا

اپنے خویش و اقارب کو اپنی آمدنی کا گویا حصہ دار سمجھتے تھے، ان کی پرورش، ان کی ضروریات کا پورا کرنا اور ان کی تعلیم پر خرچ کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا اور وہ جو کچھ کرتے تھے، دل کھول کر کرتے تھے ۔

قومی اداروں کی امداد بھی کرتے تھے لیکن یہاں بھی وہی بے نفسی کارفرما تھی، جہاںتک مجھے علم ہے، چندہ دہندگان کی فہرست میں انکا نام نہ ہوتا تھا اور نہ ہی سالانہ رپورٹ میں اس کا ذکر آتا تھا ۔

ایک دفعہ ایک سیاسی انجمن کی طرف سے امداد کے لئے خط آیا ۔ مجھ سے اس کا ذکر کیا، اور اپنی طرف سے مالی امداد کی خواہش ظاہر کی اس کے بعد اپنے آدمی سے میرے پاس پچاس روپے بھجوادئے تاکہ میں خاص ہدایت کے ساتھ داخل کردوں ۔

اور ہر جمعہ کی شب میں اچھا کھانا پکواتے اور غریبوں مسکینوں کو بلوا کر کھلاتے اور اپنے اس کام سے خوش ہوتے ع

کرامت جوانمردی و نان دہی ست مقالات بیہودہ طبل تہی ست

مجھ سے بے تکلفانہ گفتگو ہوا کرتی تھی، خوش طبعی کے ساتھ تعریف بھی کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ اس مطلب کا اظہار کرنے لگے کہ خلق خدا کی ہمدردی اور ان کی حاجتمندی اگر نہ ہو تو "قرآن قرآن" کرنے کا کیا فائدہ، میں نے کہا بالکل سچ ہے، اور میں جو بلدہ اور سکندرآباد کے درمیان عالم برزخ بنائے بیٹھا ہوں تو اس میں قدرتاً یہ بات بھی ہے کہ ہر دو طرف کے آنے جانے والے حاجتمندوں کی کچھ خدمت انجام دیسکوں مثلاً مسافروں کو کبھی کچھ کھانے کو بھی مل جاتا ہے، دم لینے اور ستانے کا موقع بھی حاصل ہے۔ یہ سنتا تو ان کے دل کی کلی کھل گئی، اور معلوم ہوا کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، سچ ہے

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اپنی مذہبی تعلیم نہ ہونے کا افسوس کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ عربی پڑھنے کے ارادہ کا کئی مرتبہ اظہار کیا، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم سے انس سا تھا، اس کے ایک باب "تلاوتِ قرآن" کا انھیں کی توجہ سے انگریزی میں ترجمہ ہوا جس کی بعد میں کتابی شکل میں ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید کی طرف سے اشاعت عمل میں آئی۔

غوثِ اعظم حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ کے بہت قائل تھے، اس کے کئی نسخے ان کے پاس تھے، کچھ اوردو وظائف کی کتابیں بھی ان کے پاس تھیں، کبھی کبھی شب بیداری بھی عمل میں آتی تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کی عبادت بغیر عقیدتمندی اور دلی رجحان کے ادا نہیں ہوا کرتی۔

کسی کے مرید نہیں تھے لیکن اگر کوئی ان کے معیار کے لائق پیر ملتا تو ضرور مرید ہو جاتے، روحانیات اور کرامات کے قائل تھے، انگریزی زبان میں بھی ایسی کتابوں کا پتہ چلتا تو اس کا مطالعہ کرتے اور چاہتے کہ دوسرے بھی اس کو پڑھیں۔

مجھ سے کہا کرتے کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دیسکتا، وظیفہ لینے کے بعد کے میرے ارادے کچھ اور ہی ہیں، مثلاً گمنامی میں زندگی بسر کروں گا، کسی مسجد میں بیٹھ کر عبادت کروں گا، کھانے کا وقت آئے گا تو

پاس کے ہوٹل سے جا کر کچھ کھا آؤں گا" قادر حسین خاں ایسے کرتے یا نہ کرتے مگر اتنا تو ہے کہ ان باتوں سے کچھ ان کی قلبی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔

کالج کے کاموں میں ان کو انہماک کا درجہ حاصل تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اگر سارا وقت اس کے لئے نہیں دیا گیا تو ان کی تنخواہ حلال کی تنخواہ نہ ہوگی، میں جب کبھی ان کے یہاں جاتا، کوئی نہ کوئی کالج کا کام ان کے سامنے ہوتا، ڈھونڈتا تو ہنسکر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے اور کہتے کہ کیا کروں ضروری کام ہے، اس کو کرنا ہے۔

نظام کالج میں جب وہ وائس پرنسپل تھے جب بھی میں نے ان کو دیکھا تھا اور پرنسپل ہونے کے بعد بھی اچھے تعلقات رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کالج کے کاموں پر اپنی صحت کو قربان کر دیا، اس کی عزت و وقار کا ان کو خاص خیال تھا، اور وہ اس کے پورا کرنے میں سعی بلیغ سے کام لیتے تھے۔

طلبہ اور کالج کے اہل غرض کو میں نے بارہا ان کے سامنے آتے دیکھا ہے، عموماً وہ پہلے اس طرح ملتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ "بے رخی" برت رہے ہیں، لیکن جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھتی ہمدردی اور دلسوزی کا اظہار ہونے لگتا، شاید وہ ضبط قائم رکھنے (ڈسپلن) کے لئے ایسا کرتے تھے۔ جس سے ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کے متعلق غلط خیال قائم کئے ہوں۔ حالانکہ امر واقعہ کچھ اور ہی ہے۔

میں کالج کے طلبا اور اسٹاف کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ناانصافی اور سازش وغیرہ سے قادر حسین خاں کا دامن ضرور پاک ہوگا۔

ایک مرتبہ انھوں نے اقامت خانہ کے طلبہ کے سامنے مجھسے تقریر کی فرمائش کی، جس میں ان کے ہاں تھے شب کے کھانے کی فہمائش بھی تھی، مدعا یہ تھا کہ طلبا کو اخلاقیات کی تعلیم ملے۔

قادر حسین خاں کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے وہ اپنی معنوی اولاد اپنے عزیز طلبہ کو سمجھتے تھے، میرا جذبہ یہ کہنے پر مجھے مجبور کرتا ہے کہ نظام کالج کو اور نظام کالج کے طلبہ کو پرنسپل تو ملیں گے لیکن اب قادر حسین خاں نہیں ملنے

میرے دوست نہیں ہیں، لیکن ملاقاتیوں کی کمی نہیں، ان میں دو ایک کو خصوصیت حاصل ہے۔
ان میں سے ایک قادر حسین خاں تھے۔

بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ میں ان کے یہاں گیا ہوں اور انھوں نے بغیر کھلائے پلائے آنے دیا ہو، میں کہتا، مجھے کھانے کی خواہش نہیں ہے، وہ کہتے ایسا نہیں ہو سکتا، پھر ہاتھ پکڑتے، کاندھے پر ہاتھ رکھتے اور کھانے کی میز کے سامنے لاکھڑا کرتے۔
چاء پینے سے انکار کرتا اور کہتا کہ مجھے یہ نقصان دیتی ہے تو کہتے چاء ہے کیا، ایک پیالی گرم پانی اس پر بھی میں نہ مانتا تو کوکو منگواتے یا کم از کم بسکٹ وغیرہ

ایک مرتبہ اچھوت قوم کے ایک مشہور لیڈر کی دعوت کی تھی، جس پر صرف محکمہ سیاسیات کے ایک مسلمان شریک دعوت تھے، مجھے اس کی اطلاع نہ تھی، دعوت سے ذرا پہلے پہنچا تو معلوم ہوا، معمولی گفتگو کے بعد میں گھر واپس آگیا۔ اس کے بعد ہی معلوم ہوا کہ قادر حسین خاں کے یہاں سے موٹر آیا ہے۔ شوفر نے کہا، صاحب نے کہا ہے کہ کھانا آپ ہمارے یہاں آکر کھائیے۔
میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس سیاسی دعوت میں میری گنجائش نہیں تھی لیکن قادر حسین خاں سے میرا آنا اور دعوت میں نہ شریک ہونا برداشت نہ ہو سکا۔

ایک دن موٹر پر لیکر "جان" کی دکان پر پہنچے، موٹر سے اتر کر اندر گئے، اور دو پلیٹ آئسکریم لانے کو کہا، میں نے کہا، نہیں تین پلیٹ لاؤ، بولے، ہاں ہاں تین لاؤ" شائد سمجھے کہ آخر میں نا مولوی صاحب زیادہ کھانے کو جی چاہا ہوگا، جب آدمی لیکر آیا تو میں نے اس سے کہا، ایک پلیٹ موٹر میں مدار صاحب

(موٹرڈرائیور) کو دے آؤ، بولے ہاں ہاں ضرور ۔

مدراس میں کوئی نئی مل قائم ہوئی تھی اور اس کی طرف سے عابد شاپ پر ایک دکان قائم ہوئی تھی، مجھ کو لے کر پہنچے، تھوڑی دیر تک سودیشی کی ضرورت اور ان کپڑوں کی تعریف کرتے رہے پھر شاید کچھ خریدا اور مجھے بھی رغبت دلائی ۔

ایک مرتبہ بعد مغرب میرے یہاں پہونچے اور بولے چلئے سکندرآباد، میں موٹر میں بیٹھ گیا، کپڑے کی کئی دکان سے مختلف قسم کی ساڑیاں وغیرہ خریدیں، میں نے پوچھا آخر یہ کس لئے ہیں، کہنے لگے دو تین جگہ تقریبات میں گذرانی ہیں ۔ اخیر میں "کوکو" کا ایک ڈبہ دکاندار سے لیا اور کہا "یہ آپ کے لئے ہے"

میں نے اوپر کہا ہے کہ قادر حسین خاں کے کوئی اپنی اولاد نہ تھی، لیکن اولاد کا کیا ذکر کہ انھوں نے سرے سے شادی ہی نہیں کی تھی، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن عجیب معیار کے ساتھ، یعنی بی بی تھوڑی پڑھی لکھی ہو، آزاد نہ ہو، خانہ داری یورپین لیڈی جیسی جانتی ہو، اور وہ شوہر کی خدمت کرنے والی ہو نہ کہ شوہر سے اپنی خدمت کرانے والی ۔

مجھے علم ہے کہ کئی لوگوں نے مختلف مقامات پر ان کی شادی کا ذکر کیا لیکن اس عرصہ دراز میں ان کو صرف ایک جگہ کی نسبت پسند تھی مگر یہ انجام کیونکر پاسکتی تھی کہ قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا ۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُن سے کسی اچھے کام کے لئے کہا ہو اور انھوں نے ناپسند کیا ہو، میں کسی اچھے قرآن پڑھنے والے کو لیکر ان کے پاس پہنچ جاتا اور قرآن سنواتا،

رمضان شریف میں شب کے وقت مختلف مساجد میں لیجاتا اور تھوڑی دیر تک بیٹھ باندھ کر

قرات میں شریک رہنا۔

عیدین میں، عیدگاہ ساتھ لیجاتے، واپسی میں بھی کبھی اپنے یہاں بھی لے آتا، میں نے اپنے یہاں کبھی کوئی دعوت کی تقریب انجام نہیں دی جب تک کہ قادر حسین خاں کو بھی شریک نہیں کر لیتا۔

مرنے سے کچھ ماہ پہلے وہ خاص طور پر ہمارے ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت کے در پے ہو گئے تھے، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ ان کو انہماک پیدا ہو گیا تھا۔

مدراس میں اسلامیہ کالج کی سلور جوبلی منائی گئی، قادر حسین خاں اس میں شریک تھے، حالانکہ مرض الموت لاحق تھا، اور ایک لانبی رخصت پر تھے، ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید کے نمائندے سے نمائش میں ملاقات ہوئی تو یہ معلوم کرکے خوش ہوئے کہ ادارہ نے اپنے تراجم بھی روانہ کئے ہیں۔

ذیابیطس کی شکایت ان کو عرصہ سے تھی مگر کئی ماہ کی طویل رخصت تو کچھ جان ہی کر لی گئی تھی، حیدرآباد سے جاتے وقت ہمراہ صرف ایک رفیق (رستم) تھا اور بس۔

ذرا اس انفرادیت کی خواہش کو دیکھئے کہ عمر بھر ان کی جولانگاہ حیدرآباد اور مدراس رہا لیکن مرنے کا وقت آیا تو سب سے بے نیاز ہو گئے اور ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے یہ آواز آ رہی ہو۔

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز   عشقِ من درپیِ من فاتحہ خوانم باقیست!

جس شب میں رحلت ہوئی ہے، سرِ شام پہاڑی سے نیچے اترے اور مسجد میں آئے، امام مسجد سے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے، پھر واپس ہوئے تو چند گھنٹوں کے بعد اعلیٰ علیین کو پہنچ گئے،

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ

ابو محمد مصلح

اصول پسندی اور بلند اخلاق

کرم فرمائے من السلام علیکم

کرم نامہ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء آج وصول ہوا یاد فرمائی کا ممنون ہوں۔ خدائے تعالےٰ جنت نصیب کرے مولوی قادر حسین صاحب مرحوم سابق پرنسپل نظام کالج بڑی خوبیوں کے حامل تھے موصوف کی اصول پسندی۔ علمی خدمت کا جذبہ اور بلند اخلاق ایسے صفات تھے کہ مخالفین کی نظریں بھی احترام سے جھک جاتی تھیں۔ اپنے کام سے انتہائی عشق رکھتے تھے۔ جس قوم کے افراد کثیر تعداد میں اس جذبے سے معمور ہوں صرف وہی قوم اس کی مستحق ہے کہ ترقی کی آرزو کو اپنے دل میں جگہ دے موصوف کی مثال ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ مرحوم نے نظام کالج کے وقار کو بڑھانے میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے لئے وابستگان کالج ہمیشہ ممنون رہیں گے فقط

خواجہ محمد احمد

"گلگشت"
سوماجی گوڑہ حیدرآباد۔ دکن
واقع ۳ تیر ۱۳۵۳ف

فنِ ادب اور علم تاریخ کیلئے

ناقابلِ تلافی نقصان

مکرمی تسلیم۔

کرم نامہ وصول ہوا۔ شکریہ۔ برسوں تک مجھے مولوی قادر حسین صاحب مرحوم کے شاگرد رہنے کا شرف حاصل رہا اور زمانۂ طالبعلمی کے بعد بھی مدتوں تک مرحوم سے دوستانہ تعلقات رہے۔ ان کے خوبیوں کا جس قدر ذکر کیا جائے کم ہے اور یقینی آپ کے رسالہ میں ان کے ہزاروں قدیم و جدید طلباء ان کی اس قدر تعریف کرنے پر مجبور رہیں گے کہ پرچہ میں کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سرکاری کاروبار سے مجھے اتنی فرصت نہیں کہ میں بھی کوئی مضمون لکھوں۔ لیکن کہیں جگہ ملجائے تو میری طرف سے اپنے پرچہ میں اتنا کہہ دیجئے کہ مولوی قادر حسین صاحب کی موت نہ صرف نظام کالج اس کے طلباء اور دوستوں کے لئے بلکہ فن ادب اور علم تاریخ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ فقط

نیازمند

غوث محی الدین

شفیق استاد مخلص دوست

حیدرآباد دکن

مورخہ ۱۳ ر تیر سنہ ۱۳۵۳ف

بخدمت جناب معتمد صاحب نظام ادب نظام کالج

مکرمی تسلیم

مولوی قادر حسین خاں صاحب مرحوم کی وفات حیدرآبادیوں کے لئے اور خاص کر ان کے لئے جن کا تعلق نظام کالج سے رہا ہے ایک نہایت ہی المناک واقعہ اور ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرحوم نے جو قوم اور کالج کے لئے خدمات انجام دیں وہ بھلائی نہیں جاسکتیں اور آج جو رتبہ و شہرت نظام کالج نے حاصل کی ہے وہ بڑی حد تک مرحوم ہی کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مجھے مرحوم کی شاگردی اور دوستی کا شرف حاصل تھا۔ میں نے انھیں ایک شفیق استاد اور ایک مخلص دوست پایا اور ان کی وفات میرے لئے باعث رنج و ملال ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں غریق رحمت فرمائے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اپنے استاد کی تعلیم پر گامزن رہ کر اپنی قوم اور کالج کی خدمت کریں جس کی توقع اپنے ہر شاگرد سے مرحوم رکھا کرتے تھے۔

خاکسار

سید محمد ہادی

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مولوی قادر حسین خانصاحب مرحوم کے بے وقت اور اچانک انتقال نے رشتہ داروں، ملاقاتیوں اور اساتذہ و طالب علموں کے ایک بہت بڑے گروہ کو ماتم گسار بنا رکھا ہے۔ اسی احساس رنج و الم کا اظہار، طلبائے نظام کالج اپنے مجلہ کی یادگار اشاعت سے کر رہے ہیں، پرنسپل صاحب کی موت ملک و قوم کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہ علم و عمل کا ایک مکمل نمونہ تھے۔

قادر حسین خانصاحب مرحوم کا سلسلۂ نسب افغانستان کے ممتاز و معروف خاندان قیس عبدالرشید کاکڑ سے ملتا ہے۔ آپ کے اسلاف انیسویں صدی کی ابتداء میں، جبکہ سارا ملک قحط عظیم کا شکار تھا، ہندستان تشریف لائے اور مدراس کے ضلع کومبتور میں مقیم ہو گئے۔ محمد شاہ علی خانصاحب ضلع کومبتور کے مشہور زمیندار تھے، آپ پرنسپل صاحب کے دادا تھے۔ آپ کے چار صاحبزادے محمد ولی خان صاحب سوداگر محمد قادر خانصاحب مجسٹریٹ، مصری خانصاحب زمیندار اور محمد قاسم خانصاحب گتہ دار اپنے ضلع کے ممتاز و نامور افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔ مولوی قادر حسین صاحب الحاج قادر خاں صاحب مجسٹریٹ کے صاحبزادے ہیں۔ قادر خانصاحب ایک عالم باعمل تھے۔ تعلیم کے بڑے شوقین تھے۔ خود بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنی اولاد کو بھی مستفید فرمایا۔ لیکن اس دنیا داری میں دین کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ تصوف اور معرفت کے ذوق نے عین عنفوان شباب میں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا، چنانچہ آپ نے قبل از وقت مستعفی ہو کر عزلت گزینی اختیار کر لی۔ مولوی قادر حسین خاں صاحب کے پانچ بھائی اور پانچ بہنیں تھیں، آپ کے بڑے بھائی محمد اسد اللہ خاں بی۔ اے، بی ال۔ مملکت سرکار عالی میں

مددگار ہوم سکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے، دوسرے بھائیوں میں نظام علیخاں صاحب و شاہ عالم خاں صاحب نے عین عالم شباب میں داغ مفارقت دیا۔ اب آپ کے مانم گسار بھائیوں میں دو علاتی بھائی مولوی فیروز خانصاحب و نواز خاں صاحب اور ایک حقیقی بہن ہیں۔

مولوی قادر حسین خاں صاحب سنہ ۱۸۹۰ء میں بمقام کوئمبتور پیدا ہوئے، ایک مرفہ الحال اور دیندار طبقے میں آپ نے آنکھ کھولی آپ کی والدہ محترمہ سادات میں سے تھیں، آپ کے نانا سیّد امین الدین بخارا کے مشائخین میں سے تھے، آپ سنہ ۱۲۰۰ کے اوائل میں سمرقند سے دہلی آئے اور مدت دراز تک اجمیر شریف میں قیام پذیر رہکر بحکم پیرو مرشد مدراس کے ضلع سیلم میں سکونت پذیر ہوئے، سجادگی و عرفانیت سارے خاندان کا اعزاز تھا۔ اس مذہبی ماحول نے آپ پر جو اثر پیدا کیا ہے وہ تادم حیات برقرار رہا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بچپن ہی سے فراست، سنجیدگی اور بردباری آپکا کردار رہا ہے، اپنی خصوصیتوں کے باعث سارا خاندان انھیں چاہتا تھا، عالم طفلی میں یہ بلند کردار اور انفرادی خصوصیات نے یہ یقین کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ مستقبل میں یہ بلند مرتبہ انسان، خاندان کی عظمت و توقیر بڑھائے گا کم سنی ہی میں موت کے بیرحم ہاتھ نے آپ کو آغوش مادر سے جدا کیا۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی اور میٹرک کی تعلیم کے لئے اپنے بڑے بھائی مولوی اسد اللہ خاں صاحب کے پاس مدراس چلے آئے۔ آپکا زمانہ طالب علمی ایک خاص امتیاز کے ساتھ گذرا ہے، مطالعہ کی جو عادت آپ نے اس ابتدائی زمانے میں ڈالی تھی وہ زندگی کے آخری لمحوں تک رہی ہے۔ آپ کا محبوب ترین مشغلہ مطالعہ ہی رہا ہے۔ وسیع مطالعہ نے آپ کے اساتذہ کو یہ یقین کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ اس طالب علم کی شخصیت میں مستقبل کا ایک ممتاز عالم چھپا بیٹھا ہے، تعطیل میں جب کبھی وطن لوٹتے آپکی یہی کوشش رہتی کہ ہمسایوں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیں، اشاعت علم کا اس قدر گہرا ذوق تھا کہ ملازمین اور ان کے بچوں کو بھی پڑھانے کی کوشش کرتے، اور تعلیم کے اخراجات بھی خود برداشت کرتے۔ اسکول میں بھی نادار طالب علموں کی ہمیشہ مالی امداد کیا کرتے تھے، اور اس اعانت سے یوں شرمسار ہوتے جیسے انھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام نہیں دیا ہے۔ ہر علمی انجمن اور تعلیمی جلسوں میں نہ صرف شریک ہوتے تھے بلکہ اس کے سرگرم

معاون تھے۔

اسکول کی تعلیم کے اختتام کے بعد مدراس کرسچین کالج میں شریک ہوئے اور یہیں سے بی اے ایم اے کے طیلسان حاصل کئے۔ ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد حکومت صوبہ مدراس کے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسری پر مامور کئے جانیوالے تھے مگر آپ نے اِن دونوں پر ریاست حیدرآباد کی خدمت کو ترجیح دی۔ ابھی اِن کا سن بیس اکیس ہی کا تھا کہ نظام کالج میں لکچراری تاریخ پر مامور کرلئے گئے، خاندان والوں نے فارغ التحصیل اور ملازم ہوجانے کی وجہ سے شادی کے لئے اصرار کیا، لیکن چونکہ آپ کو اپنی ناکتخدا بہنوں کی خانہ آبادی کی فکر دامنگیر تھی آپ نے ہنس کر ٹالدیا۔ آپ کی حیرت انگیز قابلیت اور لیاقت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے تفویض، حیدرآباد سیول سرویس کلاس کا انتظامی کام بھی کیا گیا۔

قدرت کو منظور تھا کہ آپ یوروپی تعلیم سے بھی فیضان حاصل کریں۔ چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لئے گذشتہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ۱۹۱۹ء میں آپ انگلستان کے لئے روانہ ہوئے۔ جانے سے کچھ ہی دنوں پیشتر نوجوان بھائی اور دو بہنوں کی موت نے انھیں رنج وغم کا ایک پیکر بنادیا تھا، آپ انگلستان میں جامعہ آکسفورڈ میں ریسرچ اسکالر تھے اور بیارسٹری کی طیلسان لیکر لوٹے۔

یہ خیال تھا کہ انگلستان کا قیام انکے افکار وخیال، طرز زندگی اور بود وباش میں تبدیلی پیدا کریگا، لیکن جب آپ لوٹے سب کی حیرت وتعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ وہی مشرقی آداب، وہی اپنا طریقۂ زندگی برقرار رکھا، حتیٰ کہ انگلستان میں بھی پابند صوم وصلوٰۃ رہے اور جب لوٹے ہیں آپ پر مذہبی اثرات اور زیادہ گہرے تھے، علماء ومشائخین سے بڑا نیاز تھا درویش، فقیر اور صوفیوں سے بڑی عقیدت تھی، آپ کے حلقۂ احباب میں تعجب سے ذکر ہوتا تھا کہ انگلستان میں آٹھ نو سال کے قیام نے بھی آپ کی روحانیت کو ضرر نہیں پہنچایا ہے۔

آپ جب ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد لوٹے اپنے عزیز بھائی اسداللہ خاں صاحب بی اے بی ایل مددگار ہوم سکرٹری کی جواں مرگی کا داغ دیکھنا پڑا، لندن سے واپسی کے بعد محکمہ فینانس میں مددگاری کی

کی خدمات انجام دیں اور کچھ دنوں بعد نظام کالج میں پروفیسر مقرر کئے گئے، آپ کی قابل قدر خدمات کے مدنظر آپ کو وائس پرنسپل بنایا گیا، آپ کو نظام کالج سے والہانہ محبت تھی وہ خود کو نظام کالج کی بہتری اور ترقی کیلئے وقف کر چکے تھے، آپ نے نظام کالج کے طلباء میں حیات بخش شعور پیدا کرنے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب فرقہ وارانہ تحریک حیدرآباد میں زوروں پر تھی، ملک کے تمام مدارس، کالج اور جامعہ عثمانیہ میں منافرانہ جذبات کا اظہار کیا جا رہا تھا آپ نے طلبائے نظام کالج میں ضبط و تنظیم برقرار رکھا اور گندہ سیاست کی الجھنوں میں گرفتار نہ ہونے دیا، ایک بلند نصب العین کی تخلیق اور کامیاب زندگی کی آفرینش کے لئے مرحوم نے جو کچھ کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا، نظام کالج سے آپ کی بے پایاں محبت ہی کا یہ اثر ہے کہ نظام کالج کے طیلسانین ملک کے ہر شعبہ میں ممتاز خدمات انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور بلا امتیاز مکتب خیال یہ خراج حاصل کیا ہے کہ نظام کالج کے طیلسانین علم و عمل اور بلند اخلاق کا مکمل نمونہ ہیں۔

آپ نہایت رقیق القلب اور کنبہ پرور انسان تھے، کشادہ دلی، اور علم پروری آپ کی طبیعت ثانی تھی، خاندان کے مستحق افراد کی اعانت کے خیال نے اس قدر گہرا اثر چھوڑا کہ آپ نے تجرد انہ زندگی کو ترجیح دی تاکہ اپنے اصولوں میں کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے بھائی اور بہن کی اولاد کی تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، جب آپ انگلستان سے لوٹے ہیں آپ کے بھائی اسداللہ خاں صاحب کا انتقال ہو چکا تھا آپ نے ان کے فرزند اکبر علیخاں کو اس لمحہ سے تا دم آخر اپنے ساتھ رکھا اور کبھی جدا نہ ہونے دیا، ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

مرحوم کی زندگی بھی ایک مسلسل غم ہے، انکی تقدیر میں لکھا تھا کہ وہ جوان سال بھائی اور بہنوں کا ماتم کرتے رہیں، چار سال پیشتر بہن نے داغ مفارقت دیا تھا کہ گذشتہ سال مرحوم بھائی کی نوجوان لڑکی نے بیوگی کا داغ اٹھایا۔ محمد علی صاحب مرحوم لکچرر سٹی کالج کا انتقال ان کے کم سن بچوں ہی کے لئے ایک قیامت صغریٰ نہ تھا بلکہ مرحوم کے لئے بھی ایک جانکاہ حادثہ تھا، آپ کی صحت پر برا اثر پڑا اور کمزور ہوتے گئے، ڈاکٹروں نے رائے دی کہ کچھ دنوں تک آرام لیں، لیکن ان لمحوں میں بھی کالج کی خدمت سے گریز نہیں کیا اور برابر مصروف کار رہے۔ جب

صحت بہت خراب ہوگئی آپ چار ماہ کی رخصت پر کونور تشریف لے گئے۔

مشیت ایزدی کے عجیب و غریب کھیل ایک طرفہ تماشا ہیں، کونور میں آپ کی صحت ترقی کرتی گئی۔ اس توانائی اور تندرستی سے سارے خاندان میں مسرت و خوشی کی لہر دوڑ گئی، ان ہی دنوں میں جامعہ مدراس میں جلسۂ تقسیم اسناد ہو رہا تھا آپ اپنی چہیتی بھتیجی اور بھتیجے کو ام اے طیلسان حاصل کرتے ہوئے دیکھنے کیلئے کونور سے مدراس تشریف لائے۔ بھتیجوں کی اس کامیابی پر فرحاں و نازاں تھے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، مدراس سے کونور واپس تشریف لیجا کر اپنے طبیب سے حیدرآباد واپس جانیکی اجازت چاہی، اجازت ملنے پر خطوط لکھے کہ وہ حیدرآباد آرہے ہیں ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء کے سہ پہر میں آپنے خط لکھا جس میں مراجعت کی تاریخ وغیرہ درج تھی اور فلک کجرفتار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی شب میں چار بجے انتقال کی خبر بذریعہ ٹیلگرام ملی، سارا خاندان خوش تھا کہ عید الفطر آپ کے ساتھ گذریگی، لیکن کون جانتا تھا کہ یہ عید، غم و اندوہ میں تبدیل ہونے والی تھی۔

جب آپ مدراس سے کونور پہنچے، اس کے دوسرے تیسرے روز تفریح کے دوران میں آپ کا گذر اتفاقاً قبرستان کی طرف سے ہوا۔ آپ فوراً اندر تشریف لے گئے فاتحہ پڑھی اور مقام کی تعریف کرنے لگے۔ اور اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ آپ اسی جگہ جہاں آپ نے کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی تھی آج وہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مدفن کو تجویز کر لیا تھا۔

آپ کی صحت ترقی پذیر تھی، جس روز آپ کا انتقال ہوا ہے، آپ نے سہ پہر میں ڈاکٹر سے خواہش ظاہر کی کہ قریب کے ایک مقام کو تگری جانے کی اجازت دیجائے جہاں عیسائیوں کا میلہ ہو رہا تھا، ڈاکٹر کی اجازت سے آپ تشریف لیگئے لیکن میلہ دیکھنے کے بجائے ایک مسجد میں ٹہر گئے اور عبادت میں مشغول ہوگئے، واپس ہونے کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر دس گیارہ بجے تک ڈاکٹر سے گفتگو کرتے رہے جب ڈاکٹر نے سونے کے لئے اصرار کیا تو آپ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ ابھی نصف گھنٹہ بھی گذرا نہ تھا کہ پلنگ سے گرنے کی آواز آئی، ڈاکٹر اور انکی بیوی دونوں دوڑتے ہوئے پہنچے اور آپ کو بیہوش پایا ڈاکٹر نے ضروری معالجہ شروع کیا، انجکشن دیئے لیکن آدھے گھنٹے کے اندر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی اور اللہ کے پیارے ہوگئے۔

کوئمبتور اور حیدرآباد میں جونہی اس سانحہ کی خبر ملی، سارے اعزاء واقربا گریہ کناں روانہ ہوئے، جب تمام رشتہ دار جمع ہوچکے چہارشنبہ کی عصر میں اس کنبہ پرور، علم نواز اور دردمند کو آخری آرام گاہ میں مجبوروں اور بے بسوں کے آہ وبکاہ کے ساتھ سلادیا گیا۔

قادرحسین خانصاحب کی موت سے ایک قابل پروفیسر ہی کا انتقال نہیں ہوا ہے بلکہ ایک ہمدرد، غمگسار اور قبیلہ پرور کا نقصان ہوا ہے جس کی زندگی خاندان کے حاجتمندوں کی فلاح کیلئے وقف تھی۔

اس دور میں ایسی شخصیتیں شاذ ہی مل سکتی ہیں جو رشتہ داروں اور عزیزوں کی ترقی و بہبودی کی خاطر اپنی زندگی و اپنی مسرت کو بھی قربان کردیں۔ قدرت نے مرحوم کی ذات میں انسانیت کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھردیا تھا۔ ایسی ممتاز شخصیتوں کی موت بہتوں کیلئے پیام مرگ بنجاتی ہے۔

خدائے عزوجل مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کی روح کو شفاعت محمدی عطا کرے کہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محزون

احمد النسا

اہلیہ محمد اسداللہ خاں صاحب مرحوم

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب　　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم رواں ہردم جواں ہے زندگی

اقبال

میرے چچا

دنیا میں آئے دن طرح طرح کے جانکاہ واقعے اور حادثے پیش آتے رہتے ہیں۔ احباب اور عزیزوں کی موت سے بھی متعلقین کو صدمۂ عظیم پہنچتا ہے۔ لیکن میرے پیارے چچا قادر حسین خانصاحب مرحوم کی ناگہانی اور بے وقت موت نے جو جاں گسل صدمہ اُن کے متعلقین اور لاتعداد بے یار و مددگار گھرانوں کو پہنچایا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

جس وقت میرے سر سے والد مرحوم کا سایہ اٹھا میری عمر ڈھائی یا تین سال کی تھی، چچا اُن دنوں انگلستان میں مقیم تھے۔ تین سال سے سات سال کی عمر تک میں نے بغیر شفقت پدری کے زندگی بسر کی۔ اسی دوران میں چچا انگلستان سے واپس آئے اور انھوں نے میری اس کمی کو پورا کر دیا اور میرے باپ کے قائم مقام بن گئے۔ اسوقت سے ان کی وفات تک مجھے کبھی بھی اُن خوش نصیبوں پر حسد کرنیکا موقع نہ ملا جو پدری شفقت و برکات اور محبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں اپنی موجودہ حالت پر جس قدر فخر و ناز کر سکتی ہوں وہ سب مرحوم و مشفق چچا کی شفقتوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی محبّت و شفقت کی یادگار کے طور پر میں مرحوم کی زندگی کے چند مختصر سے حالات قلمبند کرتی ہوں۔

یوں تو دنیا میں وہی لوگ بڑے مانے جاتے اور شہرت حاصل کرتے ہیں جو کہ خود کو قومی کاموں میں نمایاں کر لیتے ہیں۔ مثلاً سیاست داں۔ قانون داں۔ اہل قلم۔ مصلح قوم، ادیب۔ شاعر وغیرہ ــــ لیکن میرے نزدیک بڑا آدمی صرف وہی ہو سکتا ہے جو اپنی خانگی زندگی میں چند خاص اصول



قادر حسین خان ام اے

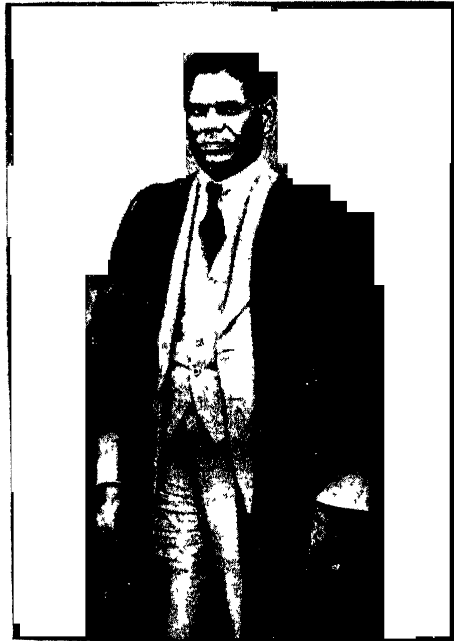
(سنہ ۱۹۱۷ء)

انگلستان جانے سے پہلے



قادر حسین خان ام اے بار ایٹ لا

انگلستان میں سنہ ۱۹۱۹ - سنہ ۱۹۲۹ء



قادر حسین خان ام اے بار ایٹ لا

زندگی کے سب سے درخشاں دور میں

(سنہ ۱۹۴۳ء)

رکھتا ہو۔ اور اُن پر کامیابی سے کاربند رہے۔ مثلاً اس کا کوئی خاص کیریکٹر ہو۔ خاص مذہبی اصول ہو اور روزمرہ زندگی کا خاص طور طریق ہو۔ اس قسم کے بڑے آدمیوں میں صرف چند ہی ایسے ہوتے ہیں جنکو اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کی حقیقی محبت حاصل ہوتی ہے۔

قوم اور پبلک کا ہیرو بنجانا بہ نسبت خاندان اور رشتہ داروں کے ہردلعزیز ہونے کے آسان ہے مگر چچا کی گھریلو زندگی سے ان کے عزیز ترین احباب تک ناواقف تھے انکی زندگی کی کامیابی کا راز قومی خدمت میں نہیں بلکہ خانگی زندگی میں مضمر ہے۔ اور میں اُنکی زندگی کے اسی رُخ پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں کیونکہ انسان کی اصلیت درحقیقت گھر ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔

اُن کے کیریکٹر کی سب سے نمایاں چیز چند اصول تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے تھے مغربی تمدن کی برائیاں اُن کے انگلستان کے دورانِ قیام میں بھی اُن کو متاثر نہ کرسکیں۔ البتہ انھوں نے اس کی خوبیوں کو ضرور اختیار کرلیا غالباً ان کے دوستوں نے انکو اکثر یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ "انگلستان جانے سے پیشتر میں صرف مسلمان تھا لیکن انگلستان کے قیام نے مجھے ایک کٹر مسلمان بنادیا" درحقیقت انھوں نے اپنی ذات میں ہندوستانی اور مغربی دونوں تمدنوں کی خوبیوں کو مجتمع کرلیا تھا۔ انھوں نے عیسائیت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جس طرح وہ قرآن مجید کی آیتوں کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح انجیل کے مقامات بیان کرتے تھے ان کا حافظہ بہت تیز اور تخیل بہت وسیع تھا میں بلامبالغہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ ملٹن کی نظم فردوس گمشدہ اور شکسپیر کی بہترین تقاریر نہایت روانی کے ساتھ سناتے تھے۔

وہ نہایت ہی ذہین تھے اور اُن میں قوت استدلال بدرجہ اتم موجود تھی اُن کی گفتگو میں کچھ ایسا تسلسل ہوتا تھا کہ سننے والے ابتدا ہی سے اندازہ لگا لیتے تھے کہ وہ آخر میں کیا کہنے والے ہیں۔ اُن کے کردار کے یہ دلآویز پہلو عوام کے سامنے بہت کم نمایاں ہوتے تھے لیکن گھر میں کسی تعطیل کے موقع پر یا لمحات فرصت میں کھانے کی میز پر مجھ سے یا کسی رشتہ دار سے گفتگو ہوتی اُس وقت معلوم ہوتا کہ وہ عام انسانوں سے کس قدر بالاتر تھے۔

ان کے اصول حیات ان کی زندگی کے حیات افروز عکس ہوا کرتے تھے۔ بلند خیالی اور

سادہ زندگی پر ان اصولوں کی بنیاد قائم تھی۔ زندگی کا کوئی لمحہ انھوں نے سستی اور کاہلی میں ضائع نہیں کیا۔ صبح اٹھتے تو سب سے پہلے بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوتے اور قرآن حکیم کے چند رکوع کی تلاوت فرماتے۔ بعد میں بائبل بھگوت گیتا اور اسی قسم کی دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھتے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ تنہا مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ اس مقدس فریضہ کی ادائگی میں اکثر بچے اور کبھی کبھی کسی رشتہ دار کو ضرور بلا لیا کرتے تھے۔ دن میں خواہ کتنی ہی مصروفیتیں کیوں نہ ہوں دنیا کی کوئی طاقت عبادت الٰہی سے انھیں باز نہ رکھ سکتی تھی اور یہ عمل زندگی کے آخری لمحے تک برابر قائم رہا۔ مصروفیتوں کے ہجوم میں رہکر بھی انھوں نے ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہونے دی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کارلائل کا مقولہ "کام کرو اور عبادت بھی کرو" رسکن کے مقولے "کام کرنا ہی عبادت ہے" سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

بہ حیثیت صدر کلیہ انھوں نے اپنے فرائض جس حسن وخوبی سے انجام دئے اس کے اعتراف میں خود ان کے شر کا ءکار مداح ہیں۔ ان میں فرض شناسی کا ایک بے لوث جذبہ کارفرما تھا حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے کالج کو بہتر بنانے میں اپنی زندگی قربان کر دی۔ کالج سے ان کو عشق تھا اور اس حد تک تھا کہ ہر وقت اسی کے خیال میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر میں اکثر اکتا جاتی تھی کہ جب دیکھو وہ کالج کی ترقی کے لئے کوئی نہ کوئی تعمیری خاکہ بیٹھے تیار کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی میں انھوں نے ایک روز کی بھی رخصت نہیں لی لیکن موت نے ان کو نظام کالج سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

ان کی زندگی سادہ تھی۔ بے جا شان وشوکت سے پاک اور غرور تمکنت سے آزاد تھی۔ ہر وقت انھیں صرف کام کی دھن رہتی تھی نہ انھیں آرام کی پروا تھی اور نہ دنیا کی دلکش فضائیں انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ مسلسل محنت اور جانفشانی کی وجہ سے آخر کار ان کی صحت نے جواب دے دیا۔

ان کی زندگی کو لافانی بنانے والی وہ قربانیاں ہیں جو انھوں نے غریبوں کے لئے پیش کی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "غریب میرے ساتھ ہیں" خاندان کے بے کس یتیموں

قابل رحم بیواؤں اور نادار افراد کی خاطر انھوں نے اپنا گھر آباد نہ کیا اور آخر وقت تک کنوارے رہے۔ اپنے مرحوم بھائی بہنوں کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا۔ وہ سب کچھ بھول سکتے تھے لیکن ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کبھی بھلا نہ سکتے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے ان کے خاندان کے کئی بے کس انسان آس لگائے بیٹھے ہیں ادھر تنخواہ ملی اور منی آرڈر روانہ کئے گئے تاکہ لاوارث بچے تعلیم جاری رکھ سکیں اور دل شکستہ بیوائیں زندگی سے مایوس نہ ہوں آہ کتنا پاکیزہ اور بے لوث جذبہ تھا۔ ان کی موت صرف خاندان کے لئے جانکاہ نہیں تھی بلکہ غیر خاندان کے سیکڑوں افراد ان سے جدا ہوکر بے یار و مددگار ہوگئے۔ جمعرات کا دن فاقہ زدہ انسانوں کے لئے پیغام حیات بن کر آتا تھا اور اس روز غربا کو وہ کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ماہ رمضان میں غربت زدہ عریانی کو ڈھانکنے کے لئے وہ کپڑا تقسیم کیا کرتے تھے۔ چہرہ سے وہ بظاہر سخت معلوم ہوتے تھے لیکن ان کے مزاج میں نرمی اور دل میں درد تھا۔

علمیت کے اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ عوام ان کو صرف معاشیات، سیاسیات اور تاریخ کا عالم سمجھتے تھے لیکن ان کی زندگی کا مسلک کچھ وسیع تھا۔ کہا کرتے تھے کہ "ہر چیز کے متعلق ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور جاننا چاہئے اور کسی ایک چیز کے متعلق ہمیں سب کچھ جاننا چاہئے"۔ وہ بیک وقت فلسفہ، طب، سائنس، قانون، ہیئت نجوم میں بھی کافی دخل رکھتے تھے یہاں تک کہ امور خانہ داری اور گھر کے انتظامات میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حلقۂ احباب میں ایک شخص کو ہر مضمون پر گفتگو کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔

ان کی روزمرہ کی زندگی خاص اصولوں کی پابند تھی۔ ان کی عادتیں مستقل تھیں۔ وقت کی پابندی اور صبح کی بیداری ان کے کردار کے سب سے زیادہ نمایاں اور قابل رشک پہلو تھے۔ یہ ان کی ہی عادت تھی اور جس کے لئے وہ اکثر مجھے نصیحت فرماتے رہتے تھے کہ سونے سے پہلے ان کی جملہ مصروفیتوں کا محاسبہ کرلینا چاہئے تاکہ ضمیر کو معلوم ہو کہ کتنی مرتبہ وہ گناہوں سے آلودہ ہوچکا ہے اور کتنی مرتبہ اچھے کام کرکے اس نے روحانی مسرتیں حاصل کی ہیں اور آنے والے دن کی مصروفیتوں کا ایک نظام العمل بنالینا چاہئے۔

ان کے چہرے سے کبھی تفکرات یا مایوسی کی علامتیں ظاہر نہ ہوتی تھیں اگر کبھی وہ تھکے ہوئے ہوتے تو احباب کے حلقہ میں بیٹھ کر بیجا بحث و مباحثہ کے ذریعہ یا دوسری دنیاوی لذت آشائی سے اپنے دماغ کو سکون مہیا نہیں کرتے تھے بلکہ مذہبی روح پرور کتابوں میں غرق ہوکر سکون تلاش کرتے تھے یا رباعیات عمر خیام کے کیف آور نغمات سے سرشار ہوکر روحانی مسرت حاصل کرتے تھے۔ مصروفیات کی گوناگونی کے باوجود خاندان کے ہر فرد سے استغنار کرتے کہ انہیں کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہر ایک کی صحت کے متعلق وہ فکرمند رہتے تھے۔ جس وقت کہ وہ سخت بیمار تھے اس وقت بھی وہ مزاج پرسی کرنے والے سے کہتے "میں بالکل اچھا ہوں پریشان مت ہو" بلکہ وہ خود ان کی خیریت پوچھتے اور حالات دریافت کرتے۔ بہرحال مرتے دم تک انھیں اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال تھا۔

بہ حیثیت ایک عہدہ دار کے۔ انصاف اور صداقت کے علمبردار تھے ناانصافی۔ خودغرضی۔ خوشامد جیسی نفرت انگیز خصلتوں سے بالکل پاک تھے۔ صدر کلیہ کی حیثیت سے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے ماتحتین میں سے ہر ایک کو خواہ وہ ادنیٰ ترین ہی کیوں نہ ہو ضرور فائدہ پہنچایا جائے۔ کالج میں بوقت داخلہ وہ چند اصول کے پابند تھے۔ تمام فرقوں کی، مدارس کی اور اضلاع کی نمائندگی کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ طالب علم کی ذاتی قابلیت اور ذہانت خیر مقدم کا باعث ہوتی تھی لیکن جس وقت ان کے اصول کی بیرونی دباؤ سے تصادم ہوکر ٹوٹتے اس وقت انھیں دلی رنج ہوتا سفارشا اور اثرات کو جو طلبا کام میں لاتے ان سے وہ سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جن اصولوں پر وہ کاربند ہیں اور جو انھیں سب سے زیادہ عزیز ہیں اگر انھیں ترک کرنے پر مجبور کیا جائے تو روحانی اذیت کا باعث ہوتا ہے۔

اپنے عہدے کے اثرات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دلاکر حقداروں کی کبھی حق تلفی نہیں کی۔ خودداری کا احساس ان میں غضب کا تھا حق تو یہ ہے کہ خاندان کی یہ خصوصیت ان میں کمال کی حد کو پہنچی ہوئی تھی اور آخری دم تک اس کو نباہتے رہے۔ ان کا حلقہ احباب وسیع نہیں تھا۔ گنتی کے چند احباب

جو تھے بھی تو ان کا تعلق بیرون حیدرآباد سے تھا۔ فطرت انسانی کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور جو روابط انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ قائم کئے ان کی تہ میں خلوص، صداقت، اور محبت کارفرما تھی۔ ان کی تنہاپسندی کو اکثر لوگ غرور اور بد دماغی پر محمول کرتے تھے لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کردار کو پہچاننا مشکل تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے چند بدخواہ بھی پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو انکی خانگی زندگی سے واقف تھے یا ان کے نقش قدم پر چلتے تھے وہ انھیں عام انسانوں سے زیادہ بلند مرتبہ سمجھنے پر مجبور تھے۔

اسے فطری کمزوری کہا جائے یا جو کچھ بھی ہی وہ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے تھے اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔ نکتہ چینیوں کے چبھتے ہوئے الفاظ اور بدخواہوں کی سازشیں ان کی صحت کو بہت زیادہ متاثر کرتی رہیں جس سے ان کا قلب بے انتہا کمزور ہو گیا۔ ان کی پاک زندگی۔ جذبہ ایثار اور بے نفسی سے اس قدر مملو تھی کہ انھوں نے کسی شخص کو ذرا بھی نقصان نہیں پہونچایا۔ کسی جائز مطالبے کو کبھی پامال نہیں کیا۔ انعام پانے کے جو مستحق ہوتے انھیں انعام سے کبھی محروم نہیں کیا لیکن ان حقیقتوں کے باوجود بدخواہوں کی جانب سے دل کو پاش پاش کر دینے والے سخت الزامات لگائے گئے۔ حالانکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب کبھی موقع ملے تو دشمنوں کو پہلے فائدہ پہنچایا جائے جس پر وہ کاربند رہے ان کے بعد پھر دوستوں کا خیال کرتے تھے۔ آخری وقت تک انھوں نے کسی کی بدخواہی نہیں کی۔ وہ اکثر کہا کرتے "خداوندا ان کو معاف فرما وہ لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" کیونکہ خدا کا ارشاد ہے "انتقام میں لونگا" خدا ان لوگوں کو جلد بلا لیتا ہے جو ہم سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا وہ جن سے ہم زیادہ محبت کرتے ہیں۔ چچا مرحوم بھی ان میں سے ایک تھے خدا ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

حیدرآباد کی ملازمت

۱۲-۱۹۱۱ء میں آپ کا تقرر پہلی مرتبہ نظام کالج میں بہ حیثیت لکچرر ہوا اور پی۔ سی۔ ایس

ہاسٹل کا انتظام وغیرہ بھی چند سال تک لندن جانے سے قبل آپ کے سپرد رہا۔ ایام لکچراری میں بھی آپ بہترین لکچرار ثابت ہوئے ۔ خوش خلقی، فیاضی، انصاف پسندی و فرض شناسی ہمیشہ پیش نظر رہی، دم بھر کے لئے بھی اپنے فریضہ سے غافل نہیں ہوتے تھے ۔ وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے کام اور دونوں کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔ درس و تدریس میں ساری عمر صرف کردی سرتاپا علم تھے ۔ تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ ہر فن مولیٰ تھے، ادب، تاریخ، معاشیات قانون، سیاست، غرض ہر ایک میں ماہر کامل تھے ۔ کامل استاد تھے، انتظامی نقطۂ نظر سے کامل منتظم تھے، انتظامی مادہ قدرتی عطیہ تھا، خدائے ذوالجلال نے صورت و سیرت دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا، حسنِ کمال و جمال سے آراستہ تھے، دوراندیشی کا یہ عالم تھا کہ کسی کام کے آغاز سے پہلے انجام پر نظر جاتی تھی، کالج کی تیس سالہ خدمات ہی اس بات کی شاہد ہیں۔ لکچراری کی خدمت تقریباً سات آٹھ سال انجام دینے کے بعد غالباً ۱۹۱۹ء میں سرکاری وظیفہ سے لندن تشریف لے گئے، جہاں تقریباً ۹، ۱۰ سال گذارنے کے بعد وطن مالوف کو مراجعت فرمائی ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد تشریف لائے ۔ لندن کی دس سالہ زندگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، دریائے علم موجزن ہونے لگا، واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ تک محکمۂ فینانس نے ان کی خدمات بہ حیثیت اسپیشل ڈیوٹی آفیسر حاصل کیں، مگر یہ تو درس و تدریس کے لئے پیدا کئے گئے تھے پھر اپنی اصلی خدمت پر بہ حیثیت وائس پرنسپل واپس تشریف لے آئے اور زاں بعد علاوہ کالج کے کام کے چند دنوں تک ناظم معلوماتِ عامہ بھی رہے یہ خدمت بھی جس حسن و خوبی سے انجام دی اس کے اظہار سے قلم قاصر ہے، زاں بعد خدمتِ پرنسپلی پر فائز ہوئے، جو پانچ سال تک انجام دیتے رہے، جس خدمت پر بھی مامور ہوئے اُس کو اِس خوبی سے انجام دیا کہ زبانِ حال سے ہر چیز اُس کی شاہد ہے، ہر ملنے والا دوبارہ ملنے کا متمنی رہتا تھا ہر ایک کو علمی مشورہ دیتے تھے خواہ وہ کسی طبقہ کا کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ نوکروں کے بچوں کو بھی علمی شوق دلاتے رہتے تھے، خاندان کے افراد کو بھی تعلیم کا ہی مشورہ دیا کرتے تھے، اُس کا تو کیا پوچھنا، غرض سرتاپا علم کا سرچشمہ تھے، علمی شغف نے ہی اُن کو ساری زندگی مجرد رکھا کبھی بھول کر بھی شادی کرنے کا خیال نہ کیا، کسی نے

مشورہ دیا اور کوشش کی بھی تو ٹالتے رہے۔ بچپن سے آخر سانس تک زندگی کا ہر لمحہ رو بہ ترقی رہا، اقبال نے دمِ آخر تک ساتھ دیا۔ کبھی زوال نے منھ نہ دکھایا، اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کبھی کسی کے ممنون نہیں ہوئے، ہر ایک کی خدمت اپنا فرضِ عین سمجھتے، خوشامد تملق سے سخت متنفر تھے، پرنسپلی کے علاوہ مدراس اسمبلی و سینٹ کے ممبر اور اعلیٰ امتحانات کے ممتحن تھے، حافظہ کا یہ حال تھا کہ جس مضمون کے متعلق استفسار کیا جاتا فوراً اسی وقت کتاب کے مصنف اور صفحے کے حوالے سے جواب مل جاتا، متعدد مثالوں سے ہر مشکل سے مشکل سوال کو حل کر کے ذہن نشین کر دیتے تھے، عام معلومات کا یہ حال تھا کہ گویا ساری دنیا ان کے پیش نظر ہے، طرزِ بیان کا یہ عالم تھا کہ سننے والا خود فراموشی کے عالم میں گھنٹوں سنتا رہتا، اور جب سلسلۂ کلام کو ادھر ختم کرتے تو وہ ہوش میں آتا۔ اور تقریر ایسی دلچسپ ہوتی کہ ادھر زبان سے نکلی اور ادھر دل میں اتر گئی۔ آپ کا ایک دفعہ لکھ دینا کامیابی کی ضمانت ہوتا تھا، طبیعت میں صلاحیت و سنجیدگی اس قدر تھی کہ کبھی کسی کو آزردہ ہونے کا موقعہ نہ دیا، ہمیشہ حق پر رہے حق پر اڑے اور حق نے ہی آپ کا ساتھ دیا، مشکل سے مشکل کام جو قرنوں میں انجام نہ پاتے انھوں نے لمحوں میں تکمیل کو پہونچائے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان اگر خلوص سے کسی کام کی تکمیل کرنا چاہے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہوگا۔ ایک ہی ادارے میں تمام عمر صرف کر دی، ہر لمحہ، ہر وقت کالج کی فلاح و بہبودی پر نظر رہی، تعلیمی مشاغل و مسائل ہی نہیں بلکہ انتظامی امور کی دھن میں ہر وقت محو پائے جاتے تھے، کالج کے در و دیوار کی فکر، شجر حجر کی فکر غرض جب دیکھو اسی میں منہمک پائے جاتے تھے، مذہبی فرائض کے بعد تمام وقت ادائیگی فرض کے لئے وقف کر دیا تھا، تعطیلات سے بھی بہت کم استفادہ حاصل کرتے تھے، درد مند اور حساس دل رکھتے تھے مگر ایمان و انصاف کا پلڑا بھاری تھا ہمیشہ ہر ایک کو خوش کرنے کی تدبیریں میں محو رہتے، ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ ملازمین، ماتحتین، طلباء و اساتذہ میں سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا گیا، بہت فراخ حوصلہ اور وسیع المشرب تھے، تعصب ان سے کوسوں دور تھا، بلدۂ حیدر آباد میں ہر جگہ ہنگامے ہوتے رہے مگر ایک نظام کالج ہی ان ہنگاموں سے محفوظ رہا جو آپ کے حسنِ انتظام کا بین ثبوت تھا کالج کا گراؤنڈ جو کبھی ناہموار سطح اور گنجان درختوں سے بھرا پڑا تھا، آج آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ چمن زار

نظر آرہا ہے، مخلوط تعلیم کی مخالفت میں اخباروں کے صفحہ کے صفحہ کالے ہوتے رہے مگر آپ نے مخلوط تعلیم کو ایسا مفید ثابت کر دکھایا کہ مخالفین کو بھی نکتہ چینی کا موقع نہ ملا۔ یہ سب چیزیں آپ کی جد و جہد و حسنِ انتظام کا نیک نتیجہ ہیں، کالج کے داخلہ پر نظر دوڑائی جائے تو یہاں بھی آپ کے حسنِ تدبر کا ثبوت مل جاتا ہے، کیونکہ مختلف جامعات اور مدارس کے طلباء اس کلیہ میں نظر آتے ہیں، امتحانوں کے نتائج ہمیشہ اول نمبر پر رہے، غرض جس پہلو سے بھی نظر دوڑائی جائے تو آپ مجسمہ خوبی ثابت ہوئے۔ آج حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے اعلیٰ عہدوں پر جو عہدہ دار مامور ہیں، ان میں بیشتر آپ ہی کے شاگرد نظر آئیں گے، کیا عدالت، کیا مال، کیا تعمیرات کیا تعلیمات غرض ہر محکمہ میں اعلیٰ حاکم آپ ہی کے شاگرد نظر آئیں گے، تیس سال کی تعلیمی زندگی نے آپ کے ہزاروں شاگرد پیدا کر دئے، جس میں سے بیشتر آپ کے قدر داں اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان پائے جاتے ہیں، آپ کا ہر کام دیانت داری سچائی اور انصاف پسندی کا آئینہ ہے، ادائیگیٔ فرض کے موقعہ پر کسی کی بے جا دشمنی یا رعب و طاقت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ہمیشہ خوفِ خدا مقدم رہتا تھا، جھوٹی شہرت و نام آوری سے نفرت کرتے تھے، ہر کام میں دوسرے کے فائدے کو ترجیح دیتے تھے، نیک نیتی، اولوالعزمی، بلند ہمتی، وسیع خیالی کا سراپا مجسمہ تھے، اپنا ہو یا بیگانہ ہر ایک کو نیک مشورہ دیتے، نصیحت کرتے، کفایت شعاری کی ہدایت کرتے، حاجتمند کی حاجت روا کرنے میں بڑے فیاض تھے، علم کے شوقین طالب علم کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، کالج کے طلباء کی سالانہ ترقی اور کامیابی سے اس قدر خوش ہوتے کہ ان کے سرپرست بھی اتنا خوش نہ ہوتے ہوں گے، اعلیٰ درجوں میں ترقی کرنے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، غرض علم کے بڑے قدردان تھے، نظام کالج میں آپ کا زمانہ عہد زرین کہلایا جائیگا، پرنسپل صاحب کی موت نے علم کے قدردانوں کو سخت صدمہ پہونچایا۔ کاش موت اور چند سال مہلت دیتی، مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

شہنشاہ بیگم ایم۔اے۔

مرحوم کی زندگی پر ایک جائی نظر

کالج کے ہر دلعزیز پرنسپل قادر حسین مرحوم کے آباء و اجداد سرحد سے دکن آئے۔ بیک وقت والیانِ ریاست کرناٹک اور ٹیپو سلطان کے پاس اعلیٰ مدنی و عسکری عہدوں پر آپ کے اجداد اعلیٰ مامور و فائز رہے۔ آپ کا تعلق کیا کرخانی پٹھانوں کے قبیلہ سے ہے جو بطور خاص اپنی بے نظیر شجاعت اور عسکریت کے لئے بلادِ ہند میں مشہور رہیں۔ آپ کے والد ماجد محمد قادر خاں قدیم روایات کے حامی اور مذہب کے دلدادہ تھے۔ سرکاری ملازمت بالخصوص گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت آپ کی فطری افتاد کو نہ بدل سکی۔ سختی کے ساتھ آپ اپنے خاص طریقہ زندگی پر قائم رہے۔ چنانچہ مذہبی داعیات اور اسلامی شعائر کی پابندی کی ایک علت باوجود ممانعات گوناگوں فرائض تکمیل حج سے باز نہ رکھ سکی۔ آپ کا انتقال سنہ ۱۹۳۰ء میں بمقام حیدرآباد ہوا۔ قادر حسین کے بڑے بھائی اسد اللہ خاں مرحوم مددگار معتمدی امور عامہ سرکار عالی تھے جو اپنی مذہبی گہرائی اور شغف کی بنا پر خلف الرشید کہے جا سکتے ہیں۔ انھیں عوامل و اثرات کا براہ راست نتیجہ قادر حسین مرحوم پر بھی عاید ہوا اور اُن کے مذہبی عقائد میں تشکیل و پختگی پیدا ہوئی۔ جو داعیات ابتدائے زندگی میں اثر انداز ہوئے وہی اثرات اُن کی زندگی کے آخری لمحہ تک باقی رہے اور نتیجتاً قادر حسین میں کبھی مذہبی گمراہی نہ پیدا ہو سکی۔ آپ بمقام کوئمبتور صوبہ مدراس سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ذہانت ایک وہبی عطیہ تھی چنانچہ بچپن ہی سے اس کا اظہار اُس لائحہ عمل کو متعین کر رہا تھا جو کارپردازان قضا و قدر کا منشاء اور آپ کی پیدائش کی علت اولین تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس تحت شعور دوری سے

علمی اشتغال سے بڑی دلچسپی اور گہرا شغف تھا علمی انجمنوں کا قیام اور اُس کے واسطہ سے نوجوانوں میں حرکت اور زندگی کے لئے کشمکش کی رغبت ایک ایسا مقصد تھا جس نے بعد میں چل کر اس احساس قومی کو زندہ کیا جس کی بناء پر قادر حسین قوم کے لئے علم وعمل کے داعیات پیدا کرنے کا باعث ہوسکے۔ رجائی لیکن جمالیاتی انداز کی تڑپ آپ کے لئے بچپن ہی سے ادب میں ایک لذت انگیز محویت رکھتی تھی۔ وقتاً فوقتاً جو مضامین اُس وقت کے رسائل میں شائع ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کی ایک شہادت بے عدیل ہیں۔ ثانوی تعلیم کے تکملے پر آپ کے والد بزرگوار نے آپ کے بے پایاں علمی شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لئے کرسچین کالج مدراس میں شریک کروایا۔ ابتدائی تعلیم میں جو حیثیت رہی ہے وہ بجائے خود قادر حسین کی شخصیت اور اُن کی طباعی کے لئے ایک نظیر ہے تو اعلیٰ تعلیم کی دقت اور کڑی منزل بھی اسی انداز پر ختم ہوئی تا آنکہ آپ نے معاشیات میں (ایم۔ اے) کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی اور جامعہ نے اس کو ایک حقیقت اور اعزاز ثانیہ تصور کرتے ہوئے آپ کو نارٹن NORTON کا انعام عطا کیا۔ آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف ہی کہنا چاہئے کہ ۱۹۱۲ء میں آپ کا تقرر انگریزی وتاریخ کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے نظام کالج میں عمل میں آیا۔ ۱۹۱۹ء تک بڑے انہماک اور والہانہ محویت سے علمی خدمات انجام دیں۔ اُسی زمانہ میں جب آپ بہ حیثیت پروفیسر ہر کہ ومہ میں مشہور ہوچکے اور آپ کی قابلیت اور ہمہ گیر اعلیٰ استعداد کی دھاک بیٹھ گئی تو اضطراراً آپ حیدرآباد سیول سروس کے لکچرار اور کچھ عرصہ بعد سیول سروس ہاوز کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں علمی اضطراب نے آپ کو مجبور کیا کہ انگلستان جائیں اور وہاں کے علم خیز وعلم زاد علم بیز ماحول سے متمتع ہوں اور تحقیقات علمیہ وحکیمانہ تربیت سے اپنے شوق میں ایک عصبیت اور اس واسطہ سے قوم کے لئے مفید مرام ہوسکیں۔

۱۹۲۹ء میں جب واپسی عمل میں آئی تو اولاً ایک سال تک بہ حیثیت اسپیشل ڈپوٹی آفیسر محکمۂ فینانس میں بہ ضمن ترتیب موازنہ و رپورٹ نظم ونسق کارگزار رہے۔ موازنہ کی ترتیب اور نظم ونسق کی رپورٹ آپس میں اجتماع الضدین ہیں لیکن اُن کا تعلق علوم عمرانی سے ہے اس لئے بہ حیثیت

ماہر معاشیات موازنہ کی ترتیب اُن کے ذوق اور قابلیت خداداد کے اظہار کی بہترین جولان گاہ کہی جاسکتی ہے تو نظم و نسق میں جو بذریعہ مشاہدہ اور عمل تحقیق استعداد حاصل کی گئی تھی وہ اس کی شاہد ہے کہ اس اساس پر پروفیسر قادر حسین نے حیدر آباد کی کیا خدمت انجام دی ہے۔ معاشیات میں بھی انھیں مالیات عامہ سے بڑی دلچسپی تھی اور یہی اُن کا مخصوص موضوع تھا۔ نظم و نسق کا یورپ میں انھوں نے جو مطالعہ کیا ہے اس میں بطور خاص معاشی عوامل کو بے حد دخل ہے نظم و نسق عامہ پر ہمہ گیر انداز میں وہی کام کرسکتا ہے جو براہ راست معاشیات میں درک رکھتا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ عصر حاضر کی سیاسی تحریکیں بغیر معاشی عمل کے سمجھ میں نہیں آسکتیں ان دونوں پر اُن کا عبور اور استعداد تامہ بلاشبہ ایک اور داعیہ ترجیح ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت بھی نظم و نسق میں اختصاص SPECIALIZATION کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے متخصیص کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اس ربط سے قادر حسین کا انتخاب ایک اور منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ ہمارا نظم و نسق بھی اختصاصی رنگ میں رنگا جائیگا اور اس کی مشنری کے اجزا مختصہ آئندہ مختص قابلیت والے افراد کے زمام اقتدار میں ہوں گے یہ صورت حال ایک فال نیک ہے جو لامتناہی ترقی کے امکانات کو پیدا کرتی ہے۔

جب قاطبتاً چندوجوہ کی بناء پر وائس پرنسپل کی حیثیت میں نظام کالج پر تقرر کیا گیا تو آپ کے میلانات شخصی اور اختصاصیت کی بناء پر انھیں شعبۂ تاریخ و معاشیات کا صدر مقرر کیا گیا۔ ملک کی بڑھتی ہوئی صورت حال جب اس کی متقاضی ہوئی کہ معلومات عامہ کا محکمہ قائم کیا جائے تو اس کی تاسیس و استحکام کی بناء پر آپ کی خدمات بہ حیثیت ناظم معلومات عامہ حاصل کی گئیں جہاں آپ نے تین سال تک نہایت جانفشانی سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۱۹۳۷ء نظام کالج کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے یعنی یہ کہ حکومت سرکار عالی نے آپ کی مساعی جمیلہ اور ان تھک علمی خدمات کے اعتراف میں آپ کو عہدۂ صدارت پر فائز کیا نظام کالج کی تاریخ میں آپ ہی پہلے ہندوستانی ہیں جو اس ذمہ دار خدمت کے اہل سمجھے گئے۔ کیونکہ ہمیشہ یہ خیال بزعم خود چھایا رہا کہ دروبست کی اعلیٰ صلاحیت فرنگی افراد ہی میں

پائی جاتی ہے چنانچہ کالج ہذا کا صدر ہمیشہ کوئی دریا پار کا بدیسی ہی رہا ہے موصوف کا یہ تقرر کالج اور کالج کے نونہالوں کے لئے ایک فال نیک ثابت ہوا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اُس کے معیار کے بلند کرنے اور طلباء میں ایک صحیح ذوق علمی کی آبیاری کے لئے وقف کردی۔ آپکی سعی پیہم اور انہماک کا عملی ثبوت وہ نتائج ہیں جو بہ اعتبار کمیت و کیفیت کالج اور کالج کے کامیاب طلباء کو موقر و ممتاز درجہ عطا کرتے ہیں۔ ہر سال جامعہ کے امتحانات کے نتائج کافی صد بڑھتا گیا اور بجائے خود یہ چیز طلبائ کے لئے ایک مہمیز ثابت ہوئی۔ نظام کالج کے طلباء عام طور پر اردو سے متعلق سرد مہری کی بنا پر حیدرآباد میں کافی بدنام تھے۔ اس علت کے ماسوا اور بھی کئی عوامل ہیں کہ جس کی بنا پر طلباء میں اردو ادب کے ذوق سلیم کی تحقیق و نسترن زاری میں پروفیسر موصوف کی قیادت بانگ درا ثابت ہوئی بناء بر آں کالج کے "افق مغربی" سے "نظام ادب" مہر نیم ماہ بنکر چمکا۔ نظام کالج کی یہ نکتہ سرائی اُردو کی ربع مسکون میں خاص منزل مقصود کو متعین کرتی ہے۔

بڑھتا ہوا تعلیمی رجحان کسی طرح محدود داخلہ کا متقاضی نہ تھا۔ مزید یہ کہ معاشی علتوں کی بناء پر طلبا مدراس کے کلیات میں داخل ہو کر اپنی علمی پیاس بہر حال بجھا نہیں سکتے تھے۔ علمی تڑپ اور علم کو عام کرنے کی تمنا پروفیسر قادر حسین کے لئے ایک تحریک ثابت ہوئی' چنانچہ کالج کی گنجائش جو جو کسی طرح وسعت کی متقاضی نہ ہوسکتی تھی وہ اس قدر محیط ہوگئی کہ ڈیڑھ سو سے زیادہ علمی پروانے کالج کے فانوس علم کے اطراف جمع ہو کر کالج کی ابتدائی منزل کی مہم سر کرسکیں۔

آپ کی شخصیت' ایثار و فدویت' خلوص اور محاسن اخلاق' کی بناء پر طلباء کے لئے باعث جذب تھی تو آپ کے علمی وجدان اور ذوق صحیح نے آپ کو کالج کے حلقہ اساتذہ میں ممتاز و مقبول کر دیا تھا۔ کالج کی ظاہری و معنوی کیفیت۔ ضبط و نظم کی ہم آہنگی۔ طلباء کا اکتساب علم میں انہماک' اساتذہ کا علمی استغراق یہ وہ خد و خال ہیں جنھوں نے ارباب حل و عقد کو کالج اور کالج کے پرنسپل کا مدح خواں بنادیا۔ انھیں عوامل کی علت پر جو روح برقائی گئی تھی وہ ہر کہ و مہ کے لئے توصیف و تحریف کی مہمیز ثابت ہوئی۔ بلاشبہ یہ مبالغہ نہیں کہ حیدرآباد سے باہر بھی کالج ایک نمونہ اور مثال بن گیا۔

روح کی تربیت کے ساتھ جسم کی صحیح اساس پر آبیاری مقتضی ہے کہ مشاغل بازی اور تفریح پر بھی توجہ کی جائے۔ چنانچہ کرکٹ پویلین کی مجرد بنیاد اس کی شاہد ہے کہ بہ حیثیت مفکر تعلیمی قادر حسین کس دل و دماغ کے آدمی تھے۔

جوہر شناسی کا مادہ آپ کی طینت کا ایک غیر منفک پہلو تھا اور اسی لئے آپ نے اُن دُر ہائے نایاب کو چُن لیا جو بہتر ماحول، بہتر تعلیم، اور تربیت کی بناء پر ملک کے لئے افراد بے عدیل ثابت ہو سکیں اور اپنی خدمات سے ملک کے معیار کو بلند سے بلند تر کر سکیں۔ طلباء کی انعامات سے ترغیب اور مختلف نہج پر ہمت افزائی اُن کے فلسفۂ تعلیم کے خاص عوامل ہیں۔ غریب طالب علموں کے ذوق میں انہماک اور مالی کشاکشوں سے نجات دلانے کی بناء پر وظائف تعلیمی اور معافی فیس اُن کا ایک خاص طریقہ عمل تھا۔

آپ کی زندگی میں مذہبی شان اور سادگی تھی۔ باوجودیکہ آپ یورپ میں کافی عرصہ رہ چکے تھے لیکن صوم وصلواۃ میں کبھی بھی فرق نہ آیا۔ ذوالقربیٰ کی متابعت نے آپ کو اپنے خاندان کے لئے نعمت غیر مترقبہ بنا دیا تھا۔ افراد خاندان تو بہر حال آپ کی ذات و تنخواہ سے متمتع ہوتے تھے لیکن غربا کے ایک معتدبہ حصّہ کی زندگی کا واحد ذریعہ آپ ہی کی ذات پُر فیض تھی۔ ہر ایک سے غریب ہو کہ امیر خندہ پیشانی سے ملتے اور ملنے والے پر آپ کی شخصیت کا سکّہ بیٹھ جاتا تھا۔

جامعہ مدراس کی تاریخ میں آپ پہلے مسلمان ہیں جو یونیورسٹی اکاڈمک کونسل کی جانب سے سنڈیکیٹ کے ممبر بہ غلبۂ آرا منتخب ہو کر تین سال تک کارگزار رہے تاآنکہ اپنی عمر کے آخری لمحہ تک بھی آپ مدراس یونیورسٹی کی سینیٹ۔ اکاڈمک کونسل اور بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن رہے۔ اس کے علاوہ عرصہ دراز سے آپ مدراس یونیورسٹی کے امتحانات بی۔ اے (آنرس) و ایم۔ اے) کے مضامین معاشیات وسیاسیات بالخصوص مالیات عامہ، بینکنگ، قرطاس زر اور فوقیت کے ممتحن رہے مزید یہ کہ (ام۔لٹ) ریسرچ ڈگری کے ممتحنین کے بورڈ کے صدر بھی رہے۔

آپ کی انگریزی کی قابلیت مسلمہ تھی۔ وسیع معلومات و تجربوں کی بنا پر ۱۹۳۷ء میں حسب فرمان خسروی آئینگار کمیٹی کے سرکاری رکن مقرر کیے گئے۔ آئینگار کمیٹی کے انعقاد کا مدعا یہ تھا کہ حیدرآباد کے مختلف طبقات اور خاص مفاد والی جماعتوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے اور انکے حقوق و مطالبوں کی علت پر نئے دستور کی تشکیل کی جائے تاکہ اس واسطہ سے ملک کی ہر جماعت حکومت کی شریک و سہیم ہو سکے سیاسی پس منظر جو کچھ بھی ہو لیکن اس کا مقصد جیسا کہ کمیٹی کے ارکان نے اپنی رپورٹ میں واضح کیا ہے یہی ہے اور ہونا چاہیئے کہ ملک کے مختلف عناصر و عوامل میں دستور کے واسطے سے ایک تعلق خاطر اور اشتراک پیدا کیا جائے تاکہ مختلف عوامل ایک ہو کر ملک کی سود و بہبود کے لئے کام کر سکیں۔

داعیات زمانے کے قطع نظر ہندوستان کے بڑھتے ہوئے سیاسی رجحانات بلاشبہ دیسی ریاستوں پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے اور اس کا امکان ہو چلا تھا کہ ایک معتد بہ عرصہ میں ہندوستان خود مختاری کا درجہ حاصل کر لیگا۔ بنا بریں ضرورت اس کی متقاضی تھی کہ اصلاحات کے ذریعہ دیسی ریاستوں میں بسنے والے افراد و جماعتوں میں بھی ایک خاص مدنی احساس اور سیاسی شعور کو برقرار رکھا جائے جو ہندوستان کی ہمہ گیر وسعت کے باوجود ہندوستان جیسے وسیع ذیلی براعظم میں بسنے والے جملہ افراد میں فکر و خیال، سیاسی و مدنی احساسات کی بنا پر یگانگت پیدا ہو سکے۔ یہ یگانگت بلاشبہ سیاسیات کے سوا خود مظاہر تمدن میں تکمیل و جامعیت پیدا کرنے کی بنا پر ضروری ہے۔

اسکا مقصد ثانی یہ ہے کہ اشتراک اغراض و معاد کی علت پر تمام مختلف عناصر میں اتحاد ذات کی ایجابی صورت پیدا کی جائے۔ مجموعی و یکجائی حیثیت سے پروفیسر قادر حسین نے کمیٹی کو کامیاب بنانے میں بڑی دقت نظری اور صیانت فکر سے کام لیا۔ ماہر معاشیات و سیاسیات ہونے کی حیثیت سے یہاں کے نفسی عوامل اور داعیات کے سمجھنے میں خاطر خواہ صحت نظری کا ثبوت دیا ہے۔ بلاشبہ وہ کمیٹی کے مساعی کے دست راست تھے اور انھیں کی موقع بہ موقع قیادت کی بنا پر انسانی فکر جس نہج پر ایک دستوری خاکہ تیار کر سکتی ہے وہ خاکہ بہمہ وجوہ کامیاب انداز میں پیش کیا۔ دستور کا مطالعہ خود اس کا شاہد ہے کہ کہاں تک دستور کی تشکیل میں انھوں نے اپنے دستوری تجر

اور عملی تجارب کی جامعیت سے فائدہ اٹھایا ہے۔

قومی خدمات سے آپ کو بے حد دلچسپی رہی ہے چنانچہ جنوبی ہند کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور صوبہ مدراس کی مسلم لیگ اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی فنڈ کے آپ معتمد رہ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ آپنے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ ثانی الذکر قومی خدمت کے لئے جنوبی ہند کے طبقہ مسلم گریجوٹ کی جانب سے آپ کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے بھی آپ رکن رہے۔ مختصر یہ کہ قومی خدمات کے ماسوا آپ کو تعلیم، تبلیغ قرآن اور تعلیم نسواں سے خاص شغف رہا ہے اور عملی طور پر اس کی اشاعت و آبیاری میں دامے درمے مدد کی ہے۔ گو آپ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن آپ کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

حمید الرحمن
نظام کالج

ایک زبردست ماہرِ تعلیم

سرزمینِ دکن کی خاکِ پاک سے جو ذرّے آسمانِ شہرت کے آفتاب بنکر چمکے ہیں اور دکن کے چمنستانِ علم کی جو کلیاں شہرت کے پھلواریوں میں پھول بنکر مُسکرائیں اُن میں علامہ قادر حسین خاں مرحوم بلاشبہ گلِ سرسبد ہیں۔ آپ کی شخصیت ایسی غیر معمولی شخصیت تھی جس کی نظیر شائد نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دنیا عموماً اور نظام کالج دکن کے اربابِ حل و عقد خصوصاً ایسی ہمہ داں اور جامعِ علوم ہستی کی غیر موجودگی کو محسوس کرینگے۔

آپ کی ساری زندگی یا تو طالب علمی میں گذری ہے یا علم و ادب کی خدمت میں اور اسی سلسلہ میں آپ کے بیشمار خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کے دِل میں نہ صرف اپنے کالج کی علمی و ادبی ترقی کا خیال تھا بلکہ دور دراز کے کالجوں اور علمی اداروں سے بھی آپ کو بہت دلچسپی تھی اور خصوصاً اسلامیہ کالج وانمباڑی کی کارروائیوں اور اُس کی علمی خدمتوں کا ہمیشہ خیال کرتے تھے اور اسی وجہ سے گو وہ ہم سے بہت دور ہی سہی پھر بھی قریب ہی تھے اور یہی وہ امر ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اس بزرگ ہستی کے متعلق اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کریں۔ سانحۂ ارتحال سے جو صدمۂ جانکاہ ہمیں پہنچا ہے اس کے بیان کی تاب ہم میں نہیں ہے اور ہم سب اس سانحہ کو ایک قومی حادثہ سمجھتے ہیں جس کی تلافی شاید اب امکانات میں نہیں ہے۔

صاحبِ موصوف کیکاڑ پٹھان قوم کے افراد سے تھے جو انیسویں صدی میں جنوب کی طرف

آ گئے تھے آپ کے جد امجد پولاچی (جنوبی ہند) میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور وہیں کے سرپرست تسلیم کر لئے گئے تھے۔ آپ کی مراجعت کے بعد آپ کے ہونہار فرزند جانشین مقرر ہوئے جن کی عمائدین شہر میں بہت عزت تھی۔ یہ اپنے علمی تبحر و دیگر خصوصیات کی وجہ سے ممتاز تسلیم کئے جاتے تھے آپ کے والدِ محترم وہیں کے تحصیلدار مقرر ہوئے جہاں سے اُن کا تبادلہ ضلع کوئمبتور کے دوسرے علاقوں میں بھی ہوتا رہا۔ آپ کی والدۂ محترمہ سیّد خاندان سے تھیں جس کے بہت سے افراد نامور صوفی اور ولی گذرے ہیں مدتِ ملازمت کے اختتام پر آپ کے والد پدیاگیا تشریف لے آئے اور وہیں مستقل طور پر آقامت گزیں ہو گئے۔ جہاں اُن کی وفات ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی اسد اللہ صاحب فنون اور قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کوئمبتور میں پریکٹس کیا کرتے تھے جس کے بعد اُن کا تقرر حکومتِ نظام میں انڈر سکرٹری کے عہدہ پر ہوا۔

علامہ قادر حسین خاں مرحوم کی تعلیم مدراس کرسچین کالج تامبرم میں ہوئی جہاں کہ وہ ۱۸۹۹ء میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں ام۔ اے کی ڈگری بہ امتیازِ اعلیٰ حاصل کی زمانۂ طالب علمی ہی میں آپ کی پیشانی پر ستارۂ علم و فضل تاباں تھا۔ وہ مختلف معاشرتی ادبی اور تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے اور اُن کے مباحثوں اور مذاکروں میں نہایت شوق و ذوق اور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ وہ اُسی زمانہ میں اپنے کالج کے اور دوسرے علمی اور ادبی رسالوں میں مقالات اور مضامین لکھتے تھے۔ وہ مسلم لٹریری سوسائٹی کے ایک سرگرم رکن رہ چکے ہیں جس کے صدر پہلے جسٹس بوڈام اور بعد میں سر اکبر حیدری رہ چکے ہیں۔ انھوں نے مدراس صوبجاتی کمیٹی میں جس کا انعقاد علیگڈھ اینگلو اورنٹیل کالج کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تبدیل کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ بہ حیثیت نائب معتمد نہایت ہی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے بعد آپ کو انگلستان بھیجنے کے لئے آغا خاں اسکالرشپ منظور کی گئی مگر اس ارادے کی تکمیل سے پہلے ہی وہ نظام کالج میں داخل ہو چکے تھے وہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک وہیں تھے کیونکہ جنگ عظیم نے اُن کے مغرب جانے کی راہ مسدود کر دی تھی ۱۹۱۹ء میں وہ عازم سفرِ انگلستان ہوئے اور وہاں قانون پڑھنے لگے اور اُس کے بعد مزید مدت کے لئے

آکسفورڈ یونیورسٹی ہی میں رہے کیونکہ وہاں سے ایک ریسرچ ڈگری لینے کا خیال تھا اسی سلسلہ میں انھوں نے فرانس اور دیگر ممالک کی سیاحت بھی کی جہاں انھیں معزز اور نامور ہستیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ہندوستان واپس آ گئے اور واپسی پر کالج کی پروفیسری کے علاوہ محکمۂ فینانس میں اسپیشل آفیسر اور ڈائرکٹر آف انفرمیشن بیورو کی حیثیت سے بھی ملک کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے۔ اسکے بعد میں وہ کچھ عرصہ تک وائس پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے اور زاں بعد آپ کی خدمت میں کالج کی صدر نشینی پیش ہوئی۔

مرحوم ایک زبردست ماہرِ تعلیمات بھی تھے اس لئے مروجہ طریقہ تعلیم میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور وہ ایچ۔ سی۔ ایس۔ کمیٹی کے ایک زبردست اور قابل ترین رکن رہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علم و فضل کا صحیح مذاق اور اصلی ذوق دکن کے طالب علموں میں اسی کالج کی بدولت پیدا ہوا اور ان مساعی میں قادر حسین خاں مرحوم کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ آپ نے اپنے ذہنِ رسا اور تبحر علمی سے وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں اور اس کو ہماری بدقسمتی سمجھیے کہ نظام کالج کا یہ سالار قافلۂ علم و فضل اور ہندوستان کا زبردست ماہرِ تعلیمات آج آسودۂ خاک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دکن کا جواہر آفرین خطہ اب بھی موتی اگلیگا۔ یہ سرزمین ہزاروں ہوشمند پیدا کرے گی لیکن علامہ قادر حسین خاں مرحوم کی جگہ جو خالی ہے وہ ہمیشہ رہے گی۔

بی محمد ابراہیم
اسلامیہ کالج وانمباڑی

حقیقت میں سیّاس

دفتر وائس چانسلر
انامَلے یونیورسٹی

میں پروفیسر قادر حسین خاں مرحوم سے گذشتہ بیس سال سے واقف تھا۔ پہلی مرتبہ ان سے میری ملاقات جامعہ مدراس کی کسی مجلس کے ایک جلسہ میں ہوئی۔ یہ جلسہ غالباً تاریخ اور معاشیات کے بورڈ آف اسٹڈیز کا تھا جو اس بورڈ کے دو حصّوں میں تقسیم ہو جانے سے پہلے ہوا تھا۔ میں سب سے پہلے مرحوم کی جسمانی وجاہت سے متاثر ہوا اور جلسہ میں ان کی ذہنی اور اخلاقی خصوصیات کا معرف ہو گیا۔ گو ان کا خاص مضمون معاشیات تھا لیکن ان کی تعلیم کا دائرہ نہایت وسیع تھا اور وہ بڑے آزاد خیال تھے۔ سیاسیات میں وہ حقیقت میں تھے لیکن اس کا تنگ نظری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خانگی زندگی میں وہ فیاض اور دریادل تھے۔ مرحوم نے اپنے غریب اعزہ کو مدد دینے کے لئے خود بہت سی چیزوں سے کفارہ کیا۔ دوستوں کے لئے وہ ایک مہربان میزبان تھے۔ جب میں پچھلی مرتبہ تقریباً سات سال پہلے حیدرآباد میں تھا تو انھوں نے اپنے دوستوں سے میرا تعارف کرانے کے لئے کئی دعوتیں کیں۔ قلعہ گولکنڈہ کا وہ تفریحی سفر مجھے بطور خاص یاد ہے جس کا انھوں نے میرے لئے انتظام کیا تھا۔ جب کبھی وہ مدراس آتے تو شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو جب وہ مجھ سے نہ ملے ہوں۔ میں اگلے دسمبر میں بین الجامعاتی بورڈ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ان سے ملنے کی توقع کر رہا تھا۔ اور اُمید تھی کہ میں اپنے قدیم کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل سے ملاقات کروں گا۔ لیکن یہ مقسوم نہیں تھا۔ مجھے انکی اچانک موت سے بڑا ہی صدمہ ہوا۔ اب اس پرخلوص دوستی کی صرف قیمتی اور محبوب یاد میرے پاس باقی ہے۔

رتنا سوامی

سوانح حیات

قادرحسین خاں سنہ ۱۸۹۰ء میں بمقام کوئمبتور پیدا ہوئے۔ آپ حاجی محمد قادر خاں مرحوم مجسٹریٹ کوئمبتور کی آٹھویں اولاد تھے۔ قادرحسین خاں ابھی کم سن ہی تھے کہ اُن کی حقیقی والدہ اللہ کی پیاری ہوگئیں، اور اس طرح موت کے بے رحم ہاتھوں نے قادرحسین خاں کو ہمیشہ کے لئے آغوشِ مادر سے محروم کر دیا۔

قادرحسین خاں کی ابتدائی تعلیم وہیں کے ایک اسکول میں ہوئی، ۹ برس کی عمر میں تحتانی تعلیم ختم کر کے اپنے بڑے بھائی اسد اللہ خاں صاحب کے ہمراہ مدراس چلے آئے اور مدراس کرسچین کالج تامبرم میں فرسٹ فارم میں شرکت کی۔ بارہ سال تک (سنہ ۱۸۹۹ء۔ سنہ ۱۹۱۱ء) قادرحسین خاں جنوبی ہند کی اس مشہور و معروف درس گاہ سے تمتع حاصل فرماتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ بارہ سال تک متواتر اقامتی زندگی کا بھی سلسلہ رہا۔

قادرحسین خاں نے یہ زمانہ پورے طالب علمانہ شان سے گزارا، علم کی تشنگی اور ذوقِ معلومات کے علاوہ اور کسی چیز کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اسی طرزِ زندگی کا سبب تھا کہ صفائی، سادگی، ہمدردی، تقسیم اوقات، ترتیب نظام العمل، وقت کی پابندی، تحصیل علم کے لئے اضطراری تڑپ اور ذوقِ مطالعہ جیسی کمیاب تعمیری عادتیں ہمیشہ کے لئے فطرت میں راسخ ہوگئیں اور فطرتِ ثانی بن کر تاحیات برقرار رہیں۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں قادرحسین خاں نے ایم اے کی ڈگری ایک غیر معمولی امتیاز کے ساتھ حاصل کی، اس درخشاں کامیابی پر جامعہ مدراس کی مجلسِ سنائٹ نے مابعد طیلسان تحقیقی تعلیمی وظیفہ عطا کیا اور مضمونِ معاشیات میں بلحاظ نشانات ساری جامعات میں اول و اعلیٰ ہونے کے 'نارٹن انعام' سے بھی سرفراز کیا۔ صوبۂ مدراس کی حکومت نے صرف ان انعاموں کو قادرحسین خاں کی علمی قابلیت کا کافی اعتراف نہ سمجھتے ہوئے۔ کئی ایک ذمہ دار عہدوں کے قبول کرنے کی دعوت دی۔ جن میں سے ایک ڈپٹی کلکٹری بھی تھی۔

خانصاحب کے علمی دنیا میں قدم رکھتے ہی ان کی قوت فیصلہ کو جانچنے اور دور بینی کو

پر رکھنے والی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں، ایک طرف وظائف اور انعامات کی کشش تھی تو دوسری طرف ملازمتوں کے پیشکش خانصاحب کو انہی دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا۔ یا تو وہ مدراس گورنمنٹ میں کوئی ذمہ دار عہدہ قبول کر لیتے یا آغا خاں وظیفۂ تشویقی لے کر انگلستان روانہ ہوجاتے۔ ٹھیک ٹھیک تو بتایا نہیں جاسکتا کہ کن باتوں نے قادر حسین خاں کو ان دونوں صورتوں کی طرف میلان کرنے سے روکا لیکن اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا اور کھلے طور سے قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ قادر حسین خاں کی زندگی کے وہ بیش بہا بارہ سال جس میں زندگی کے سانچے بنتے ہیں اور عادتیں راسخ ہوکر ہمیشہ کے لئے فطرتِ ثانی بن جاتی ہیں، تعلیمی استغراق میں صرف ہو چکے تھے۔ اور قادر حسین خاں کی زندگی اور دل و دماغ کو ایک خاص نہج پر ڈال چکے تھے اب اُن میں علم کے لئے اضطراری تڑپ کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔ طالب علمانہ زندگی کو برقرار رکھنے کے بے پناہ ولولے نے کسی ایسی ملازمت یا مشغلہ سے روکا جہاں درس و تدریس اور علم و عمل کی گنجایش بدرجۂ اقل رہ جاتی ہو۔ اور ایک سبب یہ بھی تھا کہ ابتداء ہی سے خانصاحب کے کشادہ سینہ میں جو بے پناہ وسعتوں کا مالک تھا، نوجوانوں کی تربیت اور صحیح اصول پر پرداخت کا ایک غیر معمولی جذبہ مواج اور متلاطم سمندر کی طرح پورے زور شور سے موجزن تھا۔ اسی جذبہ کی کارفرمائی تھی جس کی بدولت قادر حسین خاں ایک کامیاب ترین صدر اور ایک شفیق ترین استاد ثابت ہوئے۔

اسد اللہ خاں صاحب بی اے بی ال کے حیدرآباد آنے نے ایک ایسی راہ کی طرف انگشت نمائی کی جہاں قادر حسین خاں اپنی طالب علمانہ زندگی کا تسلسل دیکھ سکتے تھے اور اسی علم و تعلیم اور درس و تدریس کی دنیا میں رہ کر نوجوان کی سیرت اور بنائے کردار میں بھی حصہ لے سکتے تھے اسی فطری میلان نے انھیں مجبور کیا اور وہ ۱۲ ۱۹ء میں بحیثیت لکچرار زبان انگریزی اساتذہ نظام کالج کے حلقہ بگوش ہوئے۔ یہاں اہل فکر کے لئے قابل غور نکتہ ہے کہ مرحوم نے اپنے پیشہ کا انتخاب کرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں اور توجہات کو بالکلیہ اسی پر منعطف کر دیا اور اُس کا پورا پورا طرح حق ادا کیا برخلاف اس کے تلون کی دیوی کا شکار ہو کر شہرت اور نام و نمود کی بے جا خواہش کو کبھی دل میں جگہ نہیں دی۔ بلکہ وہ نفس پہ اعتماد اور خدا پر توکل "کو اپنا شعار بنایا" اور کام کے لئے وقف ہوگئے

تین سال کے اندر ہی اندر قادر حسین خاں نے وہ وقار قائم کر لیا۔ کہ حیدرآباد

سول سروس کے مؤدب بنا دئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانصاحب کو زبان انگریزی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ بیک وقت معلوماتِ جدیدہ سے ربط اور ہمہ علوم عمرانی پر عبور کامل نے انھیں اربابِ حل و عقد کی نظروں میں ممتاز و موثر بنا دیا تھا۔ اور ان کی یکتائی کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔ جب ایسی اہم خدمت کے لئے دور اور نزدیک نظریں دوڑائی گئیں تو قادر حسین کے آگے اور کوئی نظروں میں نہ جچ سکا اور ۱۹۱۵ء میں وہ اس عہدہ پر ممتاز و فائز ہوئے۔ ایسے اہم عہدے پر خانصاحب کا تقرر حکومت کی جانب سے ان کی علمی قابلیت، صلاحیتِ کار، قوتِ انتظام کا ایک بہت اچھا اعتراف تھا۔

ابھی مؤدب ہوئے ایکسال کا بھی عرصہ نہیں گذرا تھا کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس تاسیس کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۱۶ء میں قائم شدہ "مجلس تاسیس" کا مقصد اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ کو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں تبدیل کرنا تھا۔ جب یہ تحریک آغاز کی گئی تو جنوبی ہند کے تمام طیلسانیں نے باتفاق آرا قادر حسین خاں کو اپنی رائے کی نمائندگی کے لئے منتخب کیا۔ انھیں کامل ایقان تھا کہ قادر حسین سے بہتر اُن کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کوئی اور نہ کر سکے گا۔ کیونکہ بہت سے ایسے لوگ جو دلوں میں جذبۂ خدمت، درد ملت، اور ساتھ ہی نوجوانوں کے قلب و دماغ سے رابطہ قریب رکھتے ہیں وہ صلاحیت اظہار اور قوتِ عمل سے محروم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف جو ان مسحر کن صفات سے متصف ہیں انھیں ملت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ قادر حسین خاں ان دونوں خوبیوں کا ایک خوشگوار امتزاج تھے۔ وہ پہلو میں درد بھرا دل بھی رکھتے تھے اور دست و بازو میں صلاحیتِ عمل بھی۔ اسی سبب جنوبی ہند کا روشن خیال اور اہل الرائے طبقہ قادر حسین خاں کے بارے میں اعلیٰ رائے رکھتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی تاسیس کے لئے مجلس قائم کی گئی تو قادر حسین خاں کی خدمات حاصل کی گئیں اور اُن کے گوناگوں صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۱۹۱۹ء سے قادر حسین خاں کی زندگی میں اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہیں سے قادر حسین خاں کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی اور اُن کے خیالات اور ارادوں میں ایک غیر معمولی

تبدیلی کا باعث ہوئی۔ یوں تو قادر حسین خاں کے یورپ جانے کا بندوبست ۱۹۱۴ء سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن جنگ عظیم نے اُن کا راستہ روک لیا تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی ۱۹۱۹ء میں حیثیت بہ اسٹیٹ اسکالر۔ عازم انگلستان ہوئے۔

یہاں پہنچ کر قادر حسین خاں نے جس طرح اپنی زندگی گذاری وہ پسِ پردہ رکھی جانے کے لائق نہیں ہے بلکہ وضاحت کے ساتھ معرض اظہار میں لانا دوسروں کے لئے شمع ہدایت اور دلیلِ راہِ سعادت ہوگا۔ انہوں نے نیو کالج آکسفورڈ میں شرکت کی اور ڈاکٹر ارنسٹ بارکر (جو آجکل کیمبرج میں فن سیاست کے استاد ہیں) اور پروفیسر ڈبلو۔جی۔ایس۔آڈمس (جو آج کل آکسفورڈ میں وارڈن آف آل سولز ہیں) کی ہدایات میں مقامی خود اختیاری اور مرکزی حکومت کے تعلقات پر تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ ان دو آئمۂ فن کے ذخیرۂ معلومات سے فیضیاب ہونے کے علاوہ وہ انگلستان کی شہرۂ آفاق درسگاہ "لندن اسکول آف اکنامکس" میں سڈنی ویب (لارڈ پسفیلڈ) اور پروفیسر گراہم والس اور پروفیسر لی۔اسمتھ کے دروس اور تقریروں سے بھی کما حقہٗ استفادہ کیا اور محض انکی خوشنودی ہی حاصل نہیں کی بلکہ اُن کے زیر ہدایات تحقیق کرنے والے خاص طلباء کے گروہِ اعلیٰ میں بھی شریک رہے۔ قادر حسین خاں نے اِن اساتذہ کے علم و تجربہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اُن کے درس پابندی سے حاصل کئے، اُن کی تقریروں کو توجہ سے سُنا اور حافظہ پر مرتسم کیا، اُن کی بتائی ہوئی کتابوں کا غائرانہ مطالعہ کیا اور اُن کے سوجھائے ہوئے طریقوں کو روبہ عمل لاتے رہے۔ اُن کی ہدایات پر شدت سے کاربند رہے۔

لیکن اُن کی بڑھتی ہوئی علمی پیاس کے لئے یہی کافی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مرحوم نے بالکلیہ اساتذہ کے اشارات اور گنی چنی کتابوں پر دارومدار نہیں رکھا بلکہ علاوہ اُس کے خود ذاتی طور سے اکتساب علم کیا۔ اپنے فن کے علاوہ متعدد علوم کا مطالعہ کرتے رہے۔ تحقیقات کے سلسلے میں فرانس اور انگلستان کے کتب خانوں کو چھان ڈالا، اور تحقیقات کا سلسلہ ختم ہونے تک انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، بلیو تھک نیشنل (پیرس) جیسے مشہور و معروف کتب خانے مدتِ قیام تک اُن کی جولان گاہ بنے رہے۔ تمام آئمہ فن سے گہرے تعلقات اور روابط پیدا کئے

اور دل کھول کے اُن کو بھی ٹٹول لیا اور اُن کے دفتر کھنگال ڈالے ۔ تمام آئمۂ فن سے جو انگلستان اور اُس کی نواح اور برِ اعظم پر تھے رابطہ بڑھایا اُن کے ہمہ گیر معلومات اور وسعتِ مطالعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ ایسے علماء کی صحبت میں دن رات گذارے ۔ جنھوں نے قادر حسین خاں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ۔ وہ پہلے علم کے دلدادہ تھے تو اب تلاشِ حق اور ثبوتیت کے دلدادہ ہو گئے ۔

مرحوم نے اس خاص شعبہ میں اتنی مہارت پیدا کی اور ایسا امتیاز حاصل کر لیا تھا کہ جب خود انگلستان میں پہلی دفعہ " ادارہ نظم و نسقِ عامہ " کی داغ بیل ڈالی گئی تو قادر حسین خاں کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں پر زور الفاظ میں سراہا گیا ۔ اور اس طرح ، اُسی شخص کے ہاتھوں نے جس نے مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ جیسے اداروں کی تاسیس میں معاونت کی ایک اور شہرہ آفاق ادارے کی بنیاد میں نمایاں حصہ لیا ۔

علم عمرانی کی اس خاص شق یعنی علم سیاست مدن میں عبور کامل کو اور کامل تر بنانے کے لئے اور اُس میں ایقان اور کاملیت کا درجہ حاصل کرنے کے لئے قادر حسین خاں نے قانون کی اہمیت کو محسوس کیا جس کے بغیر تمام علوم عمرانی کی تکمیل کماحقہ نہیں ہو سکتی تھی ۔ چنانچہ اس غرض و غایت کی تحت مرحوم نے مڈل ٹمپل کے مشہور و معروف ادارے کی طرف رخ کیا ۔ وکالت کی سند حاصل کرنے کے بعد یہاں بھی قادر حسین خاں نے اُسی مشقت اور انہماک کو کام فرمایا جو اُن کی فطرتِ ثانی بن چکی تھی اور " چیمبر ریڈنگ " میں شرکت کر کے پھر ایک بار ذوقِ تحقیق کی داد دی ۔ یہاں گلبرٹ اسٹون (جو بعد کو سر کے خطاب سے ممتاز ہوئے آجکل ناگپور ہائی کورٹ کی عدالت عالیہ کے میر مجلس ہیں) کے زیر ہدایات تربیت پائی اور وہی درجہ حاصل کیا جو انھیں سیاست میں حاصل ہوا تھا ۔ الغرض سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک مرحوم یورپ میں رہے اور اس دوران میں اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کتابوں کے مطالعہ ، دساتیر کی تحقیق ، محققین سے تبادلۂ خیال ، مشاہیر سے علمی بحث و مباحث ، آئمۂ فن سے ربط ضبط ، مطالعہ قانون و دستور کی خاطر ممالک کے سفر سے مملو نظر آتا ہے ۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں قادر حسین خاں حیدرآباد واپس آئے اور یہاں پہنچتے ہی انھیں یہ امتیاز

حاصل رہا کہ بہ حیثیت "عہدیدار خاص" بہ ضمن ترتیب موازنہ و تکمیل روئداد" اُن کی خدمات محکمۂ فینانس نے حاصل کیں۔ یہ اہم خدمات انجام دے چکے تو ۱۹۳۰ء میں نظام کالج کی پہلی خدمت پر لوٹ آئے اور انگریزی جماعتوں کو اپنی بیش بہا معلومات سے مستفیض کرتے رہے۔ لیکن اب علوم عمرانی میں قادر حسین خاں نے ایک ماہر فن" بلکہ امام وقت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی بناء پر ۱۹۳۱ء میں انھیں صدر شعبۂ تاریخ و معاشیات اور معین صدر کلیہ بنا دیا گیا۔ جامعہ مدراس کے ارباب نے ایسے امام فن کی خدمات کو اپنے نظام تعلیم کی اصلاح و فلاح و ترقی کے لئے لابدی سمجھا۔ اور اسی سال جامعہ مدراس کی اکاڈمک کونسل نے انھیں رکن سنڈیکیٹ انتخاب کیا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء تک فرائض منصبی کے علاوہ "قادر حسین خاں" ناظم معلومات عامہ کی حیثیت سے بھی کئی خدمات انجام دیتے رہے۔

مرحوم کا مطالعہ اور علمی تجربہ ہر لمحہ رو بہ ترقی رہا۔ انھوں نے دفتری کاروبار میں پڑ کر یا شان افسری کے نقاضر اعتباری میں مبتلا ہو کر اک لخت علمی دنیا کو خیر باد نہیں کہہ دیا۔ بلکہ برخلاف اس کے اُس ذوق میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ایک ہی ساتھ جامعہ مدراس کی مجلس سنا" اکاڈمک کونسل" بورڈ آف اسٹڈیز ان اکنامکس" کے رکن بنائے گئے۔ اس کے دو ہی سال بعد ۱۹۳۶ء میں وہ جامعہ مدراس کے بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کے ممتحن بنائے گئے اور خاص طور سے خصوصی مضامین مثلاً بنکنگ" تسکیک" اور مالیات عامہ قادر حسین خاں کے سپرد کئے جاتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب حیدرآباد کے لئے ایک نئے دستور کی توضیح و تشکیل کی جا رہی تھی تو قادر حسین خاں" بفرمان خسروی" اصلاحات کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ اور اس اہم اور بنیادی کام میں قادر حسین خاں نے حکومت کی خدمت رضاکارانہ

مسٹر جان پرنسپل زرگی جاگیردار کالج پر روانگی کے بعد وہ اس درسگاہ کے صدر بنائے گئے۔ صدر کلیہ ہونے کے بعد قادر حسین خاں نے کالج اور طلبائے کالج" اساتذہ اور اہل دفتر کی فلاح و ترقی کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ نظام کالج میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہرگز بے جا نہ ہوگا اگر خانصاحب کے دورِ صدارت کو تاریخ نظام کالج کا عہد زرین، یا کالج کی زندگی کا دورِ شباب کہا جائے ۔ ۱۹۴۰ء میں جامعہ مدراس نے قادر حسین خاں کو ایک اور امتیاز سے ممتاز کیا، وہ ممتحن ام۔اے لٹ ریسرچ ڈگری کے صدر بنائے گئے۔ شیخ کلیہ کی کرسی پر فائز ہونے کے بعد قادر حسین خاں نے جن غیر معمولی صلاحیتوں کی داد دی ہے اور جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ سب بیان سے باہر ہیں، چونکہ ہرکہ ومہ اِن خدمات سے بخوبی واقف ہے اس لئے ہم اِن کی تفصیل قلم انداز کرتے ہیں

پانچ سال کی محنتِ شاقہ نے، جو قادر حسین خاں نے بجوشِ خدمت اپنے آپ جائز کرلی تھی، اُن کی صدارت کے چھٹے سال کے آغاز کو انجام تک پہنچنے نہیں دیا۔ اور ایک طویل علالت کے سلسلے کے بعد قادر حسین خاں نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۳ء کو اس دارِ فانی سے عالم بقا کا رخ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ناصر الدین خاں

کالج کیپٹن نظام کالج

دیکھ یہ جادۂ ہستی ہے سنبھل کر فانی — پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا آتی ہے

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — فانی — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت — فانی — زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

تبحرِ علمی

مولوی قادر حسین خاں صاحب مرحوم سابق صدر (پرنسپال) کلیہ نظام (نظام کالج) سے مجھے غائبانہ نیاز تھا مگر میں ان کی قابلیتوں اور کارکردگیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے کلیہ نظام کے لکچرار' اور پھر پروفیسر اس کے بعد ناظم معلومات عامہ اور پھر نائب صدر کلیہ نظام کی حیثیت سے مرحوم نے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح ثابت کر دکھایا۔ جب مسٹر ٹرنر جاگیردار کالج کے پرنسپال بنائے گئے تو ان کی جگہ پُر کرنے کے لئے فوراً آپ ہی پر نظر پڑی اور یہ آپ کی ذاتی لیاقت اور قابلیت ہی کی وجہ تھی کہ آپ سب میں پہلے ہندوستانی صدر کلیہ نظام بنائے گئے حالانکہ یہ جائداد ابتدا سے یورپین افراد کے لئے ہی مخصوص تھی اور یہ امر خاص طور سے قابلِ ستائش ہے۔

اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے ساتھ ساتھ مرحوم کا ضبط اور انتظام ایسا تھا کہ سب رطب اللسان تھے۔ بہ حیثیت ایک قدیم طالب علم کے مجھے کلیہ نظام سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔

مولوی قادر حسین صاحب مرحوم کے زمانہ میں کلیہ کے امتحانات کے نتیجوں اور تعلیمی ترقی کے حالات سنکر مجھ کو مسرت ہوئی تھی۔ آپ نے اس کلیہ کی اصلاح اور فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ تمام علم دوست حضرات مرحوم کے تبحرِ علمی سے بھی واقف تھے۔ وہ تنہائی پسند واقع ہوئے تھے اور دعوتوں اور مجلسوں میں بہت کم حصہ لیا کرتے تھے ان کا زیادہ وقت مکان پر مطالعہ میں صرف ہوا کرتا تھا۔ ہم ہندوستانیوں میں ایسی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیتوں کا قحط الرجال ہے۔ جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا اور وہ بھی ایسی ذات سے جو نعم البدل ہو آج کل محال ہی سا ہو گیا ہے۔ کلیہ نظام کو جو نقصان ان کی قبل از وقت موت سے

پہنچا ہے مجھے اس کا دلی صدمہ ہے۔ اور دعا ہے کہ خداوند کریم کالج کو ان کا نعم البدل اور ان کے اعزا و احباب کو صبر جمیل اور ان کی روح کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

حسن یار جنگ

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا — اقبال

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے — زندگی کی شاخ سے پھوٹے پھلے مرجھا گئے — اقبال

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے — ذوق

جان اللہ نے لی جسم ہوا داخلِ گور — ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا — اکبر

موت اک زندگی کا وقفہ ہے — اور آگے چلیں گے دم لے کر

کامیاب مؤدّب

عزیزی قاضی احمد بشیر الدین سلمہٗ ۔ اتفاق سے آج ہی ایک قطعۂ تاریخ نظم ہوگیا جو ملفوف ہے[1]۔
اس قطعہ کے دو ابتدائی مصرعہ قابلِ تصریح ہیں۔

مرحوم بی۔اے' اور سول سروس کلاس میں میرے استاد تھے اور میرے زمانہ میں اقامت خانہ سول سروس کے مودب بھی تھے۔ اگرچہ وہ مجھ سے اور میرے ساتھی طلباء سے صرف دو تین سال کے بڑے تھے مگر اُن کا علمی وقار اور اُن کی خاموشی خودداری سول سروس ہاوز میں اُن کا اثر قائم کرنے کافی تھی اُس زمانہ میں کوئی بے طوری یا بدمزگی کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے اُن کے حالات زندگی یا اُن کے اخلاق و اوصاف کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس رسالہ کا ہر لفظ اُن کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کرتا ہے۔ تفصیل اس کی بہت ہوسکتی ہے۔ لیکن اُن کے پرستاروں کے لئے اس رسالہ کی وسعت ہی کافی ہے۔ مخالفین کے لئے تو ایک دفتر بھی شاید تشفی بخش نہ ہوگا۔

قاضی محمد زین العابدین

---

[1] قطعۂ تاریخ مذکور الصدر رسالہ کے ابتدائی صفحہ پر درج کیا گیا ہے۔